U16958. P 23770

Title - ISLAM MEIN IMAMAT KA TASAWOUR.

Author - Maulvi Badar uddin Jalandhari.

Publisher - Sheikh Ghulam Ali And Sons Tajraan K (Lahore).

Date - 1948.

Pages - 135

Subjects -

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ

اسلام میں امامت کا تصوّر

از

مولوی بدرالدین صاحب بدر جالندھری

ناشران
شیخ غلام علیؒ اینڈ سنز تاجران کتب
لاہور
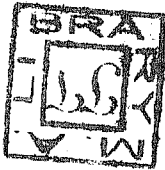
بار اوّل سنہ ۱۹۴۸ء

شیخ نیاز احمد پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں طبع کرا کر
کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

انتساب

میں اپنی اس ناچیز تالیف کو علامہ **اقبالؒ** کے نام جن کے کلام کی روح جا بجا میری اس کتاب میں نمایاں ہے۔ منسوب کرتا ہوں۔ کیونکہ آپکے چیدہ اور منتخب اشعار نے جگہ بجگہ چسپاں ہو کر میرے اس مضمون میں بیداری کی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔

خاکسار
بدر جالندھری

۵
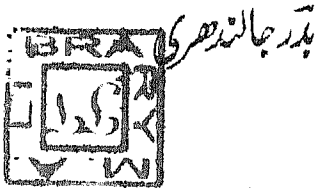
عرض مؤلف

بِللہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر مے خواست
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید!

پاکستان کے قیام کے بعد قوم کے تعمیری پروگرام کی تکمیل کا مسئلہ عام مسلمانوں کے زیر بحث ہے۔ اور کسی قوم کی فلاح و نجاح کا تمام تر دار و مدار اس کی صحیح قیادت پر ہے۔ قائدینِ ملّت و آئمہ مساجد کی رہنمائی کے لئے اردو زبان میں اسوقت تک کوئی ایسی اسلامی کتاب موجود نہ تھی جو ان کی ضروریات کو کلّی یا جزوی طور پر پورا کر سکے۔ لہذا میں نے انکی تمام ضروریات کو یکجا جمع کر کے قوم کی اس اہم ضرورت کو کسی حد تک پورا کر دیا ہے۔ اور نئی روشنی کے نوجوان طبقہ کے ذہن میں قیادت کا خالص اسلامی تصوّر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے میں امید کرتا ہوں کہ قائدینِ ملّت کیلئے عموماً اور آئمہ مساجد کیلئے خصوصاً اس کتاب کا مطالعہ نہایت فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ بلکہ ہر مسلمان کو حسب استعداد اس ناچیز تالیف کے مطالعہ سے مستفید ہونا چاہئیے۔ ع

ایں دعا از من و از عالمِ اسلام آمین!

خاکسار:- بدر جالندھری

فہرست مضامین

امامتِ کبریٰ

سبق پڑھ پھر صداقت کا عدالت کا شجاعت کا

لیا جائیگا تجھ سے کام، دنیا کی امامت کا!

امامت کا مطلب

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے!

امامت و قیادت دو مترادف لفظ ہیں۔ جن کے معنی سرداری یا Leader-ship کے ہیں۔ اور امام کسی قوم کے پیشوا یا Leader کو کہتے ہیں۔ امامت کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ امامتِ کبریٰ (بڑی) و امامت صغریٰ (چھوٹی)۔ کسی قوم کی دینی یا دنیوی جملہ امور میں ہر قسم کی رہنمائی کرنا امامت کبریٰ کہلاتی ہے۔ اور کسی ایک چیز یا نماز کی امامت امامتِ صغریٰ کے نام سے موسوم کیجاتی ہے اسلام اور مسلمانوں کی تمام ضرورتیں امامت اور امام سے ہی پوری ہوتی ہیں۔ اور امامت کے بغیر مسلمانوں کی قوم جسدِ بے روح ہے۔ آج مسلمانوں کی تمام تباہ کاریاں اور بربادیاں محض اسی لئے ہیں۔ کہ امامت کا مقصد صحیح طور پر پورا نہیں ہو رہا۔ کیونکہ بہترین امام کا نہ ہونا سینکڑوں دینی و دنیوی برکات سے محرومی کا باعث ہے۔

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو!

کسی مذہب کا حقیقی کمالِ صداقت یہ نہیں ہے۔ کہ وہ محض اخلاقی و روحانی اصولوں کو ایک کتابی صورت میں جمع کر کے اپنے متبعین کے حوالے کر دے۔ اور ان اصولوں کی پشت پر کوئی عمل کرانے والی قوت اور نظام حیات پیش نہ کرے۔ بلکہ حقیقی کمال یہ ہے کہ ان اصولوں کے حق میں ایک ایسی فضا بھی پیدا کر دے اور پیروانِ مذہب کے اردگرد اطاعت و فرمانبرداری کا ایسا مضبوط قلعہ باندھ دے۔ کہ کسی حالت میں بھی وہ اس سے خارج نہ ہو سکیں۔

پس اگر کوئی مذہب اپنے اندر عمل کرانے والی طاقت نہ رکھے۔ اور پیروانِ مذہب پر کوئی خارجی اثر نہ ڈالے۔ تو وہ مذہب بیکار اور بے جان ہے۔ اور اپنے پیروکاروں کے لئے فلاح و نجاح کا صحیح راستہ دکھانے سے قاصر ہے۔ لہذا مذہب کی زندگی کا راز صرف اسی بات میں ہے۔ کہ وہ اعلیٰ اخلاقی و روحانی اصول دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اور ساتھ ہی اُن کے لئے ایک ایسی مستقل فضا بھی پیدا کر دے جس سے سوسائٹی کا ہر فرد ان اصولوں کی پیروی کرنے پر طوعاً و کرہاً مجبور ہو جائے ان کی نشو و نما کے لئے فضا اور زمین مہیا کرے۔ بدکرداری کے راستے میں روک لگا دے اور پرہیزگاری کی راہیں کھول دے۔

پس اسلام کے نزدیک مذہبی حدود کی حفاظت کرنے والی اور اشخاص کو مذہبی احکام پر قائم رکھنے والی قوتیں اور خارجی مؤثرات و محرکات تین ہیں۔ اوّل حکومت، قانون اور پولیس۔ دوم مختلف قسم کی امیدیں اور خوف۔ سوم زندگی کا

عملی نظام اور پبلک رائے۔ ان ہر سہ محرکات میں سے امامت کا تعلق عموماً محرک
دوم سے ہے جس طرح اسلام نے محرک اوّل و دوم کی نسبت نہایت شدومد کے ساتھ
تعلیم دی ہے۔ اسی طرح محرک سوم یعنی اسلامی زندگی کے عملی نظام کے ضمن
میں امامت و امام کے متعلق بھی مفصل ہدایات ارشاد فرمائی ہیں۔

غرض امامت اور امام کیا ہے۔ وہ نظام ضابطہ اور حکمران جو مسلمانوں کے
ارد گرد اطاعت خداوندی کا ایک مضبوط قلعہ کھینچتا ہے۔ انہیں فرمانبرداری و
اطاعت کے قلعہ میں محصور کرتا ہے۔ ان کو روحانی و ابدی صحت کا پیالہ پینے پر
مجبور کرتا ہے۔ اور فسق و فجور کی تمام ظلمات اور تباہ کاریوں کو دور کر کے ان کی
اخلاقی و روحانی ترقی کے لئے حرارت اور روشنی مہیا کرتا ہے۔ اور فساد فی الارض
سے اپنے مقتدیوں کو روکتا ہے اور قوم کے متفرق افراد کو ایک مرکز پر جمع کر کے
ان کی شیرازہ بندی کرتا ہے وہی شخص عرف عام میں امام کہلاتا ہے۔ اور اس کی
تمام تر کارگذاری امامت و قیادت کے لفظ سے تعبیر کی جاتی ہے ؎

مومن کیلئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی!

امامت کا مقصد

جو کرتی ہو جہانگیری محمدؐ کی غلامی کر
عرب کا تاج سر پر رکھ خداوندِ عجم ہو جا!

اسلام کی سب سے پہلی امامت بانیِ اسلام سردارِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھ میں تھی۔ جس طرح دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب اسلام ہے، اسی طرح دنیا کے سب سے بڑے امام سیّد الانبیاء خیر البشر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ آپ نے اپنے تئیس سالہ عہدِ نبوّت میں قوم ملک اور انسانیت کیلئے جو تعمیری کام انجام دیا۔ اسکی نظیر تاریخِ عالم میں اور کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ آپ نے دنیا کے جاہلوں کو عالم، ظالموں کو عادل، وحشیوں کو مہذّب، بد اخلاقوں کو با اخلاق، بے اخلاقوں کو باحیا، غیر متمدنوں کو متمدن، ڈاکوؤں کو پاسبان اور گڈریوں کو بادشاہ بنادیا۔ اور اتنا ہی نہیں۔ بلکہ ان تو ہیوں میں انہیں ساری دُنیا کا امام بنادیا۔ قعرِ ذلّت سے اُٹھا کر بامِ عروج تک پہنچایا۔ غلامی کی مصیبت سے نجات دلا کر آزادی کا لطف سکھایا۔ ہلاکت و ادبار کے

گڑھے سے نکال کر خلافت یعنی شاہنشاہیت کے تخت پر بٹھایا۔ غرضیکہ ان کے ہر قبیح کو مبدّل بہ حسن کر دیا۔ اور ان کی ہر قسم کی معصیت پر معصومیت کا رنگ چڑھا دیا۔

ساری دُنیا جانتی ہے۔ کہ اس حیرت انگیز انقلاب کا سبب وحید فقط آپ کی صحیح قیادت تھی۔ جس کی روز افزوں ترقی کو دیکھ کر مخالفین کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اور مقابلہ کی تاب نہ لا کر آخر آپ پر جادو کا الزام لگا دیا۔ مگر آپ کی پاک تعلیم نے لوگوں کے دلوں پر ایسا قبضہ جمایا کہ لاکھ جتن کرنے کے باوجود بھی وہ اُٹھائے نہ اُٹھ سکا۔ مگر آج ؎

تا شعارِ مصطفٰے از دستِ رفت

قوم را رمزِ بقا از دستِ رفت!

آپ کے نصابِ تعلیم کا تمام تر دار و مدار صرف خدا کی آخری کتاب قرآن پر تھا۔ جسکے ذریعے آپؐ نے عقیدۂ توحید ذہن نشین کرنے کے بعد انہیں نماز روزہ۔ زکوٰۃ اور حج پر عمل کرایا۔ اور آپکی صحیح قیادت کے زیر اثر قرآن کے اس مختصر لائحۂ عمل نے ان پر ایسا رنگ چڑھایا۔ کہ ان کی فوج بے نظیر، ان کی اطاعت بے مثیل، ان کا ایثار لاثانی، ان کے جج سراپا انصاف، ان کی مساوات ضرب المثل، وہ محنت کے عادی، مشقت کے دلدادہ، بھوک و پیاس سے مانوس، رات کو یادِ الٰہی میں بیدار اور دن کو میدانِ مقابلہ کے شہسوار نظر آنے لگے۔

اسلام کی یہ خدا پرست منظم جماعت جس کا ایک ہی قبلہ، ایک ہی مرکز، ایک ہی امام، ایک ہی سرواد، ایک ہی قول، ایک ہی فعل، ایک ہی صورت، ایک ہی مطلب اور ان ساری وحدتوں کا ایک ہی مقصود خدائے وحدہٗ لاشریک ہے ؎

خدا بھی ایک، نبیؐ بھی ایک اور اسلام بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک!

اگر اب بھی اس کی صحیح قیادت کی جائے اور امامت کا مقصد صحیح طور پر پورا کیا جائے تو اسلام کے ان پانچ ارکان میں آج بھی وہی پیغام حیات موجود ہے۔ جس نے تمام دنیا کے تمدن میں ایک انقلاب عظیم برپا کر کے اطراف وجوانب کی تمام بڑی بڑی حکومتوں کا تختہ اُلٹ دیا تھا۔ کیونکہ جب یہ خدا پرست جماعت ایک دفعہ پھر اسی وحدت کا درس عبرت حاصل کر کے دنیا میں ایک نیا قدم اُٹھائے گی۔ تو "اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ" کے وعدہ کے مطابق لازمی طور پر خدائی طاقت ان کی مدد کیلئے آئیگی زمین و آسمان کے خزانے ان کی خدمت کے لئے وقف کر دئے جائیں گے۔ قوم کی مردہ رگوں میں زندگی کا تازہ خون دوڑنے لگے گا۔ محکوم قوم از سرِ نو حاکم بن جائے گی۔ اور آپس میں دست وگریبان ہونے والی قوم باہم شیر و شکر ہو جائے گی ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی!

امامت کا اثر

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کرکے چھوڑونگا!

پس جب یہ خدا پرست منظم جماعت کامل اتحاد کے ساتھ باہمی اُلفت و ایثار کے جذبات لے کر پھر ایک ہی امیر کے ماتحت ہو جائے۔ اپنی تمام تر کوششیں ایک ہی مرکز اور ایک ہی مقصد کے ساتھ وابستہ کردے۔ اور گھر سے کھا کر اپنے امیر کے اشارے پر اپنی جان پر کھیلنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اور اپنے تمام آئمہ مساجد کو اسی ایک امیر یا قائدِ اعظم کے ہمنوا بنالے۔ تو ان کی ہر مشکل آسانی سے بدل جائے گی۔

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے، کوششِ ناتمام سے!

اور امام بھی وہ شخص ہو جس کے سینے میں وہی علم و عرفان ہو۔ وہی غیرت و شجاعت ہو جو سید المرسلین، خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سینۂ اطہر میں تھی۔

اور وہ سوائے خدا تعالیٰ کے کسی سے نہ ڈرے۔ نہ کسی کی پرواہ کرے۔ نہ کسی سے طمع رکھے۔ بات وہ کہے جو خدا تعالیٰ اور اُس کے رسول کو پسند آتے۔ اور جس سے اسلام کا بول بالا ہو۔ مسلمانوں کا بھلا ہو۔ انہیں عزت و حرمت نصیب ہو۔ عدل و انصاف پھیلے۔ دُنیا میں امن قائم ہو۔ حق سے سرکشی کرنے والے نیست و نابود ہوں۔ پھر ایسے امام کی خدا خود پشت و پناہ ہوگا اور " وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ط" کے وعدہ کے مطابق ہر معاملہ میں اس کی پوری پوری مدد کرے گا۔

جب مسلمانوں میں یہ نظام پیدا ہو جائے۔ تو پھر یہ لوگ کسی دوسری قوم کے محکوم نہیں رہ سکتے۔ جب یہ آزادی کے لئے قدم بڑھائیں گے۔ تو آزادی خود ان کے استقبال کے لئے آگے آئے گی۔ تمام مشکلات مبدل بہ آرام ہو جائیں گی ہر ایک مقصد میں کامیابی حاصل ہو گی۔ مُردہ قوم زندہ ہو جائے گی۔ قوم کے بیکار افراد باکار نظر آئیں گے مفلسوں اور محتاجوں پر خزائن الٰہی کے دروازے کھل جائیں گے اور تمام قوم مالا مال ہو جائے گی۔

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے، ضمیرِ کُنْ فکاں ہے زندگی!

جس قوم کا ایسا امام ہو۔ وہ قوم اپنے آپ کو ایک قلعہ میں محفوظ سمجھتی ہے اور ایسا امام بمنزلہ ایک حکمران کے ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے امام کی اطاعت سے

گریز کرے۔ اُسے حاکمانہ سلام بجالانے سے جی چرائے وہ باغی سمجھا جاتا ہے۔ جُرم بغاوت فرد ہونے کے بعد بھی ایک مدت تک اسے دنیا کی زندگی میں مہلت دی جاتی ہے۔ اگر پیغام موت پلنے تک بھی وہ اپنی ضد سے باز نہ آئے تو پھر جہنم کے جیلخانہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔

پس اگر ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان اپنی اس سیزدہ صد سالہ تنظیم کی پھر تجدید کر لیں اور اپنے قائدِ اعظم کے اشارے پر پوری طرح چلنے لگ جائیں۔ اور ان کے تمام آئمہ مساجد صحیح معنوں میں سیّد المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے جانشین ہو جائیں۔ جن کے خطبے میں جان ہو۔ ہر ایک فقرے میں تڑپ ہو۔ ایک ایک لفظ میں زندگی کا پیغام ہو۔ حاضرین کے دلوں کی تار ان کی پانچ اُنگلیوں میں ہو۔ جب اسے دبائیں۔ جو آواز چاہیں نکلوائیں۔ کسی چھوٹے یا بڑے کو اُس کی حکم عدولی کی طاقت نہ ہو۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ تمام طاغوتی اور مادی طاقتیں اس خدائی طاقت سے لرزہ براندام نظر آئیں گی۔ اُنہیں جراٗت نہ ہو گی کہ اس منظم جماعت سے آنکھ ملائیں۔ اور اپنی ہستی معرضِ خطر میں ڈالیں۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دِل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

امامت کی ضرورت

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی!

اگر تمام نظامِ عالم پر سرسری نظر ڈالی جائے۔ تو جمادات، نباتات اور حیوانات وغیرہ اس کے مختلف اجزاء نظر آتے ہیں۔ پھر ہر ایک جنس کی مختلف انواع ہیں۔ مثلاً جمادات کا باب کھولا جائے۔ تو مٹی، پتھر اور دھاتیں وغیرہ ہزاروں مختلف چیزیں نظر آتی ہیں۔ اگر نباتات کے باب کو دیکھا جائے تو چھوٹے بڑے بیشمار درخت، پودے بوٹیاں، بیلیں اور گھاس پھوس وغیرہ دکھائی دیتی ہیں۔ اور سب کے پھل پھول، تاثیر ذائقہ اور خصوصیات وغیرہ جدا گانہ ہیں۔ اسی طرح اگر رب العالم جلّ مجدہٗ کے دفترِ حیوانات کو دیکھا جائے تو اس میں خشکی و تری کے دو بڑے باب نظر آتے ہیں۔ اور پھر ہر ایک باب میں ہزاروں قسم کے جاندار ملتے ہیں ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورق دفتریست در معرفتِ کردگار!

جس طرح جمادات، نباتات اور حیوانات کی مختلف قسمیں ہیں۔ اسی طرح انسان کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ بظاہر اگرچہ سارے انسان اعضائے انسانی میں مشترک نظر آتے ہیں۔ لیکن رنگ روپ، قد و قامت، وضع قطع، عادات و اطوار، رسم و رواج، انتہا یا دیا وسیاسیات، وطنیت، ذہنیت، خوراک اور پوشاک وغیرہ کے لحاظ سے اُنکی بیشمار قسمیں بن سکتی ہیں۔ اور ان خصوصیات کے لحاظ سے ہر ایک جتھا ایک قوم کہلاتا ہے اور ہر قوم کی خصوصیات مختصہ ایک دوسری سے جداگانہ ہوتی ہیں۔

ہر ایک چیز کی بقا اس کے اجزائے ترکیبی کی بقا سے ہوتی ہے۔ اگر کسی چیز کے اجزائے ترکیبی کو کچل دیا جائے تو وہ چیز فناہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک درخت کا پھل توڑ کر پتے جھاڑ دئے جائیں۔ شاخیں اور تنے کاٹ دئے جائیں۔ جڑ کو اُکھیڑ کر پھینک دی جائے۔ اس کے تمام اجزا اگرچہ علیحدہ علیحدہ آنکھوں کے سامنے پڑے ہوئے ہوں۔ لیکن اس کو درخت کوئی نہیں کہے گا۔ بلکہ درخت اسی صورت میں تھا۔ جبکہ ہر ایک چیز اپنی اپنی جگہ پر قائم تھی۔ اسی طرح اگر کسی قوم کی خصوصیات قومی فناہ ہو جائیں تو اس کے منتشر اجزاء اگرچہ دنیا میں موجود ہوں گے۔ لیکن اس قوم کو قوم نہیں کہا جائیگا۔ اور اگر کہا جائیگا تو زندہ قوم نہیں کہا جائیگا۔ بلکہ اسے مردہ قوم کی فہرست میں شمار کیا جائیگا۔ اس کے لیئے

بجائے اسکے	بدنصیب ہوگا۔
۱۔ اپنی قوتِ بازو کا سکہ دوسروں پر بٹھائے۔	دوسروں سے ٹھوکریں کھائیگی۔

۲۔ دوسری قوموں کو اپنے اندر جذب کرے۔	خود جذب ہو جائیگی۔
۳۔ اپنے ننگ و ناموس کی حفاظت کرے۔	دوسروں کے رحم پر چھوڑی جائیگی۔
۴۔ اپنے اسلاف کی عزت کرائے۔	انکی توہین و تذلیل کرائیگی۔
۵۔ خودداری و غیرت کا پیکر ہو۔	ذلیل اور بے غیرت دیکھی جائے گی۔

ہندوستان میں مختلف قومیں آباد ہیں۔ مثلاً ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی وغیرہ ہمارے سارے اعضائے انسانی میں تو مشترک ہیں لیکن اپنی اپنی خصوصیات مختصہ کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ قومیں شمار کی جاتی ہیں۔ مسلمان آٹھویں صدی عیسوی کے ابتدار میں یہاں آئے اور انیسویں صدی کے درمیان تک ساڑھے گیارہ سو سال انہوں نے ہندوستان پر حکومت کی۔ اس کے بعد ایک انقلاب عظیم آیا اور اس انقلاب عظیم اور اس سے پیدا شدہ بعد کے ماحول سے مسلمانوں کی خصوصیات قومی پر ایک کاری ضرب لگی جس سے اخوت، فتوت، دیانت، امانت، کفائت اور للّٰہیت وغیرہ اوصاف حسنہ سے وہ محروم ہوتے چلے گئے۔ اور بالآخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ نہ خوف خدا، نہ فکر عاقبت، نہ حیا و شرم، نہ صورت اسلامی، نہ جذبات اسلامی، نہ غیرت اسلامی، نہ حمیت اسلامی، نہ بڑوں کی عزت۔ نہ چھوٹوں پر شفقت غرضیکہ ہر خوبی ان سے کوسوں دور ہو گئی ؎

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی!
وہ قوم آج ڈوبے گی، گر کل نہ ڈوبی!

اسراف ان کی گھٹی، ریا ان کا لباس، خوشامد ان کی لونڈی، غیبت ان کا مشغلہ، مقدمہ بازی ان کی رسم اور جھوٹی شہادتیں ان کی برادرانہ حمائت بن گئی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تمام مسلمان عذابِ الٰہی میں مبتلا ہو گئے۔ افرادِ قوم تو ایک طرف ائمہ قوم بھی امامت کی صلاحیّت سے محروم ہو گئے۔ جب ان میں اپنے فرائض منصبی کو پورا کرنے کی اہلیّت نہ رہی۔ تو پھر قوم اور افرادِ قوم کا تو خدا ہی حافظ ہے۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملّا۔

کارِ طفلاں تمام خواہد شد!

اگر لیل و نہار یہی حال رہا اور غفلت شعاری کی یہی کیفیت رہی۔ تو (خاکم بدہن) ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ نسلیں کلمۂ اسلام اور نامِ اسلام سے بھی بے بہرہ ہو جائیں گی جسکا علاج سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔ کہ قومی عمارت کی از سر نو تعمیر کی جائے۔ تمام افرادِ قوم کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔ سب کی باگ ڈور ایک ہی قائدِ اعظم کے سپرد کی جائے۔ علمائے اُمت اور رہنمایانِ قوم سیّد المرسلین کے اسوۂ حسنہ کا پھر زندہ نمونہ بن جائیں۔ اپنی امامت کے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے پورا کریں۔ اور اپنی پوری طاقت خرچ کر کے قوم سے تعمیل کرانا اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں جس کا سارا دار و مدار امامت کے مقاصد کو صحیح طور پر پورا کرنے پر ہے۔

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنّا دے
جو روح کو تڑپا دے، جو قلب کو گرما دے!

امامت کا انتخاب

اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
ہرمن اندر جہاں ارزاں، و یزداں دیر یاب!

ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کی مختلف جماعتیں نظر آتی ہیں۔ جن کو سرسری نظر سے چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل طبقۂ علماء۔ دوم جدید تعلیم یافتہ طبقہ۔ سوم طبقہ اہلِ دولت و ثروت اور چہارم طبقۂ عوام۔ علماء کی پھر دو قسمیں ہیں۔ اوّل علماءِ سوء اور دوم علماءِ ربّانی۔ علماءِ سوء کو تو حق سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ انہیں محض اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا بھلا ہو یا نہ ہو۔ آپس میں لڑ مرے یا منتشر و منکر ہو کر رہے بلکہ پنجاب میں تو علماءِ سوء کوشش کر کے ایسے مسائل کی ترویج و اشاعت کرتے ہیں جو زمانۂ رسالت مآب فداہ اُمی و ابی یا زمانۂ صحابہ کرامؓ یا آئمہ اربعہؒ کے زمانے کی پیداوار نہیں ہیں۔ بلکہ بعد میں کسی وقت کی ایجاد و اختراع ہیں۔ جن پر اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کبھی متحد ہو ہی نہیں سکتی۔ مسائلِ متفق علیہا کو چھوڑ کر

ایسے اختلافی مسائل کو اصول دین بناتے ہیں۔ اور جاہلوں پر خوب رنگ چڑھاتے ہیں اوران کے دلوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کے متعلق نفرت کا بیج بوتے ہیں علماء سوء کو اس کے سوا کوئی مشغلہ نہیں "اِنَّ شَرَّ الشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَاءِ" یعنی "بدترین شرارت علماء کی شرارت ہے" کی حدیث آنحضرتؐ نے انہی علماء سوء کے حق میں ارشاد فرمائی ہے۔ ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد!

علماء ربانی کی پھر دو قسمیں ہیں۔ اوّل علماء ربانی بے حس۔ دوسرے علماء ربانی ضروریات قومی سے آشنا اور اقدام عمل کرانے والے علمائے ربانی بے حس اگرچہ حق پرست طبقہ ہے۔ ان میں اعلان حق کی جرأت موجود ہے۔ جو بات انہیں سمجھ میں آجائے۔ بلا خوف و ہراس کہہ سکتے ہیں لیکن بجز مستثنیات اس مذاق کے حضرات کو بھی مسلمانوں کی ضروریات وقتیہ کا بہت کم احساس ہوتا ہے۔ ان میں سے اکثر حضرات معاشیات و سیاسیات سے قطعاً نا آشنا ہوتے ہیں۔ موجودہ وقت میں غیر مسلموں کی چالبازیوں اور مکاریوں سے بہت کم واقف ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ بھی مسلمانوں کی صحیح قیادت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہی باعث ہے۔ کہ مصلحین کی صف میں ایسے علماء کرام کا وجود بہت کم دیکھنے میں آتا ہے ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

دوسرے علماء ربانی وہ ہیں جو ضروریاتِ قومی سے آشنا اور لوگوں میں عملی روح پھونکنے والے ہیں۔ اُن کی تعداد بہت ہی قلیل بلکہ اقل ہے۔ اور اگر کہیں حسنِ اتفاق سے اللہ تعالےٰ کا کوئی بندہ ایسا پایا بھی جاتا ہے۔ تو اس طوطی کی آواز نقار خانے میں کون سُنتا ہے جہاں ایسے حق پرست عالم کی آواز اُٹھتی ہے۔ وہاں بدعت پسند اور شکم پرست علماء شور برپا کر دیتے ہیں۔ کہ یہ شخص وہابی ہے۔ بے ایمان ہے۔ بزرگوں کا منکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہے۔ لہٰذا اس کی بات مت سُنو۔ اس کی شکل مت دیکھو۔ اس کے پاس مت جاؤ۔ اسے کافر اور مرتد کہو۔ اور جو اس پر تبرّا نہ کہے اسے بھی ملحد اور بے دین سمجھو۔ آخر نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ جو آوازِ حق دس ہزار آدمیوں کو پہنچتی اور راہ حق میں اکسیر کا اثر رکھتی۔ وہ بمشکل تمام دس بیس آدمیوں تک پہنچتی ہے۔ تمام قوم اس کی خدمات سے محروم رہ جاتی ہے۔ حالانکہ وہ ہر وقت ان کی خدمت کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ " اِنَّ خَیْرَ الْخَیْرِ خِیَارُ الْعُلَمَاءِ " یعنی " بہترین خیر علماء کے چیدہ آدمی ہیں " کی حدیث رسول اکرمؐ نے انہی علماء کے حق میں ارشاد فرمائی ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان، کہ گم اسمیں ہیں آفاق!

درحقیقت امامت کا مستحق یہی گروہ ہے چونکہ مغربی تہذیب اور زمانہ کے

ماحول سے قوم کے دل و دماغ ماؤف ہو چکے ہیں۔ جسطرح ایک مریض بعض اوقات میٹھی دوائی کو بھی کڑوی محسوس کرتا ہے۔ اور اس کے پینے سے منہ بناتا ہے۔ اور ڈاکٹر اس کی صحت کو بحال کرنے کیلئے اسے کڑوی دوائی پینے پر مجبور کرتا ہے۔ اسی طرح ان کی تلخ تعلیم بھی قوم کے روحانی مریضوں کو بعض اوقات ابتداً تلخ معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ اسے بآسانی قبول نہیں کرتے۔ لہذا ایسے حالات میں ان خدا پرست سچے علماء کو بھی ذرا حکمت عملی (Tect) سے کام لینا چاہیئے۔ اگر براہ راست اپنا اثر و رسوخ استعمال نہ کر سکیں۔ تو پہلے تمام قوم کو ایک ہی قائدِ اعظم کی تقلید پر مجبور کریں۔ اور پھر اس کی طرف سے مدد پا کر از سر نو ان کے جذبات میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ جس کے لئے حوصلہ اور ہمت درکار ہے۔ استقلال شرط ہے۔ لگاتار اور اَن تھک کوشش درکار ہے۔ بہترین ٹیکٹ (Tect) کی ضرورت ہے۔ ؎

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اسکی خودی کو　　ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر!
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب　　سونے کا ہمالہ ہو، تو مٹی کا ہے اک ڈھیر!

امامت کی اہلیت

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اُس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے!

طبقۂ علماء میں جس طرح علماء سُوء اور علماء ربانی بے حس خود کسی دوسرے کی امامت کے محتاج ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی باقی تین جماعتوں یعنی جدید تعلیم یافتہ طبقہ، طبقۂ اہل دولت و ثروت اور طبقۂ عوام کو بھی کسی صحیح امامت کی اشد ضرورت ہے۔ طبقۂ علماء کی طرح تعلیم یافتہ طبقہ کے بھی عموماً تین گروہ نظر آتے ہیں۔ اوّل فناہ فی المغربیت۔ دوسرے زندہ دل مگر ڈرپوک اور تیسرے مجاہد فی سبیل اللہ۔ ان میں سے پہلا گروہ جسے فناہ فی المغربیت کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ لوگ ہیں جنہیں زمانۂ تعلیم میں تعلیم اسلام سے بے بہرہ رکھا گیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ یہ طبقہ نصاب تعلیم الاسلام یعنی قرآن و حدیث کی بجائے نصاب تعلیم یورپ کا عالم بن گیا ہے۔ تہذیب اسلامی کی بجائے تہذیب یورپ کا دلدادہ ہو گیا ہے۔ تمدّن اسلامی سے متنفر ہو کر تمدّن

یورپ کا فدائی ہے۔ عموماً یہ طبقہ وضع قطع نشست و برخاست، خورد و نوش، اور لباس و پوشاک میں اپنے آپ کو یورپین ثابت کرنا چاہتا ہے لیکن افسوس ہے۔ کہ ان بیچاروں کی پھر بھی درگت بن جاتی ہے۔ کہ کالے گورے کا سوال کسی طرح حل نہیں ہو سکتا۔ لیکن

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!

بفضلہ تعالیٰ اس تعلیم یافتہ طبقہ کا دوسرا گروہ زندہ دل اور قومی ضروریات کو من و عن سمجھنے والا بھی موجود ہے۔ لیکن افسوس کہ ان میں سے بعض حکام وقت اور حکومت سے خائف اور بعض اپنی خواہشات کی بناء پر برادرانِ وطن سے اس قدر مرعوب ہیں۔ کہ ع "آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں"، کا مصداق ہیں۔ ایسے لوگوں کا وجود قوم کے لئے سُود مند نہیں۔ اور ان کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ طبقہ اسلام اور مفاد قوم کو اپنی وفاداری کی پوری نقیض سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ وہ شائد یہ خیال کرتا ہے۔ کہ میں نے ہمدردئ قوم کا نام لیا تو ہتھکڑی اور جیلخانہ تیار ہے ملازمت کے چھین جانے کا خطرہ ہے۔ اس لئے وہ کہتا ہے۔ کہ "ما بخیر و شما بسلامت"، عافیت اسی میں ہے۔ کہ دنیا میں مزے سے زندگی گذارو۔ آخرت کی خدا جانے ہے

ناخدا در کشتی ما گر نباشد گو مباش

ماخدا داریم ما را ناخدا درکار نیست!

تعلیم یافتہ طبقہ کا تیسرا گروہ جو مجاہد فی سبیل اللہ کہلاتا ہے۔ وہ اگرچہ قلیل بلکہ اقل ہے۔ مگر ان کا وجود کفر کے لیے خارِ چشم، ان کی تحریر کفر کے لئے سیف قاطع ان کی تقریر کفر کے حق میں پیغام موت اور ان کی نقل و حرکت کفر کے وجود میں نشتر جراحی ہے۔ علماء ربانی جو ضروریات قومی سے آشنا ہیں۔ ان کے بعد اگر کوئی گروہ قوم کی صحیح قیادت کر سکتا ہے۔ تو وہ یہی مجاہد فی سبیل اللہ کا گروہ ہے اگر یہ دونوں گروہ باہم مل کر کسی قوم کی امامت کا بیڑہ اُٹھائیں۔ یا خوش قسمتی سے کوئی ایسی قابل ہستی مل جائے جو ہر دو طبقات کے جملہ اوصاف کی پوری پوری حامل ہو۔ تو پھر نورٌ علیٰ نور ہے۔ اور وہی شخص قوم کا قائدِ اعظم کہلانے کا مستحق ہے۔ وہی قابل قدر ہے۔ اور اس کا وجود قوم کے لئے از بس غنیمت ہے۔ اسی کی امامت قوم کے لئے داعی الی الجنتہ ہو سکتی ہے۔ اور اس کے علاوہ باقی تمام جماعتوں کی امامت مسلمانوں کیلئے داعی الی النّار کا حکم رکھتی ہے۔

تیسرے مسلمانوں کا دولت مند طبقہ ہے۔ یہ طبقہ عموماً زر پرستی میں محو، اپنے تعیش کا دلدادہ اور ضروریات مذہبی سے قطعاً ناواقف ہے۔ باقی رہا طبقہ عوام تو وہ کا الانعام ہے۔ وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے۔ اس قدر افلاس ہیں اس کو اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ کچھ سمجھ سکے۔ وہ تو جس کے ہاتھ میں پڑ گیا۔ اسی کا راگ الاپنے

لگ گیا۔ اگر کسی عالم سُو نے اسے شکار کر لیا۔ تو اسی کا ہو گیا۔ اگر کسی بے دین دُنیا دار کا ملازم ہو گیا۔ تو اسی کے خیالات میں رنگا گیا۔ ان کی تو اپنی کوئی رائے ہی نہیں۔ ؎

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

امامت کا انحصار

دل مُردہ نہیں ہے، اسے زندہ کردوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ!

جب تاریخ عالم پر نظر ڈالتے ہیں۔ اور نظام عالم کا نقشہ دیکھتے ہیں۔ اور مختلف قوموں کی امامت پر نگاہ کرتے ہیں۔ تو سب سے پہلے یہ امر قابلِ غور معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس دنیا میں امامت و قیادت کا مدار آخر ہے کس چیز پر؟ وہ چیز کیا ہے۔ جسکی بنا پر کبھی مصر امام بنتا ہے۔ اور دنیا اس کے پیچھے چلتی ہے۔ کبھی بابل امام بنتا ہے اور دُنیا اس کی پیروی کرتی ہے۔ کبھی یونان امام بنتا ہے اور دُنیا اس کا اتباع کرتی ہے۔ کبھی مسلمان امام بنتے ہیں اور دُنیا ان کے نقشِ قدم پر ہو لیتی ہے۔ اور کبھی یورپ امام بنتا ہے۔ اور دنیا اسکی تتبیع بن جاتی ہے۔ پھر وہ کیا چیز ہے؟ جس کی وجہ سے امامت آج ایک کو ملتی ہے۔ کل اس سے چھین کر دوسرے کے پاس چلی جاتی ہے اور پرسوں اس سے بھی سلب ہو کر تیسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ کیا یہ محض ایک بے ضابطہ یا اتفاقی امر ہے۔ یا اس کا کوئی

ضابطہ اور اصول بھی مقرر ہے۔

سو اس مسئلے پر جتنا زیادہ غور کیا جائے۔ اس کا جواب یہی ملتا ہے۔ کہ ہاں! اس کا ایک ضابطہ ہے۔ اسکی ایک اصل ہے اور اس کا ایک کلیہ ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ امامت کا دامن ہمیشہ علم کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ انسان کو بہ حیثیت ایک نوع کے زمین کی خلافت ملی ہی علم کی وجہ سے ہے۔ اس کو سمع، بصر اور فواد تین چیزیں ایسی دی گئی ہیں۔ جو دوسری مخلوقات ارضی کو یا تو نہیں دی گئیں یا اس کی بہ نسبت کم دی گئی ہیں۔ اسلئے وہ اس بات کا اہل ہُوا۔ کہ دوسری مخلوقات پر خداوند عالم کا خلیفہ بنایا جائے۔ اور وہ اشرف المخلوقات بن کر تمام دنیا پر حکومت کرے۔

اب خود اس نوع میں سے جو طبقہ یا گروہ علم کی صفت میں دوسرے طبقوں اور گروہوں سے آگے بڑھ جائے گا۔ اور اپنی علمی استعداد میں سب پر گویے سبقت حاصل کرلے گا۔ وہ اسی طرح ان سب کا امام بنے گا جس طرح انسان من حیث النوع دوسری انواع ارضی پر اسی چیز کی وجہ سے خلیفہ بننے کا اہل ہُوا ہے سہ

بنی آدم از علم یابد کمال
نہ از حشمت و جاہ و مال و منال!

اب یہاں دوسری بات جو قابل غور ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ علم سے مراد کیا ہے؟

اور اس میں آگے بڑھنے اور پیچھے رہ جانے کا مفہوم کیا ہے؟ سو اس مسئلہ کا حل سمع، بصر اور فؤاد ہی کے الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ کلام الٰہی میں یہ تینوں لفظ مجرد سننے، دیکھنے اور سوچنے کے معنی میں ہی استعمال نہیں ہوئے۔ بلکہ سمع سے مراد دوسروں کی فراہم کردہ معلومات حاصل کرنا ہے۔ بصر سے مراد خود مشاہدہ کر کے واقفیت بہم پہنچانا ہے۔ اور فواد سے مراد ان دونوں ذرائع سے حاصل کی ہوئی معلومات کو مرتب کر کے نتائج اخذ کرنا ہے۔ اور یہی تین چیزیں مل کر وہ علم بنتا ہے جس کی قابلیت انسان کو دی گئی ہے۔ بر سبیل اطلاق اگر دیکھا جائے تو تمام انسان ان تینوں قوتوں سے کام لے رہے ہیں۔ اور اسی وجہ سے مخلوقات ارضی پر خلیفانہ تسلط ہر انسان کو حاصل ہے۔ ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھئے گا۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ جو انسان انفرادی طور پر ان تینوں قوتوں سے کام لے رہے ہیں۔ وہ پست اور مغلوب رہتے ہیں۔ انہیں تابع اور مطیع بن کر رہنا پڑتا ہے۔ ان کا کام پیچھے چلنا ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ ان تینوں قوتوں سے زیادہ کام لیتے ہیں وہ برتر اور غالب ہوتے ہیں۔ متبوع اور مطاع بنتے ہیں۔ رہنمائی و پیشوائی انہیں کے حصے میں آتی ہے ؎

ترا علم در دین و دنیا تمام
کہ کار تو از علم گیرد نظام!

مگر امامت ملنے اور چھننے کا ضابطہ معلوم کرنے کے لئے آپ کو اس سے بھی

زیادہ تفصیلی نگاہ ڈالنی ہوگی۔ اس تفصیلی نگاہ میں آپ کو یہ حقیقت نظر آئے گی کہ ایک گروہ انسانوں کا امام اس وقت بنتا ہے۔ جب وہ ایک طرف ان معلومات کا زیادہ سے زیادہ حصہ جمع کرتا ہے۔ جو ماضی اور حال کے انسانوں سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ دوسری طرف خود اپنے مشاہدہ سے مزید معلومات فراہم کرنے میں لگا رہتا ہے تیسری طرف ان دونوں قسم کی معلومات کو مرتب کر کے ان سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ اور پھر ان نتائج سے کام لیتا ہے۔ پہلے کی جو چیزیں غلط ——— کم از کم اس کے اخذ کردہ نتائج کے لحاظ سے غلط ——— ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی اصلاح کرتا ہے۔ پہلے کی جن چیزوں کا نقص ——— کم از کم اس کے فہم کے لحاظ سے ——— اس پر کھلتا ہے۔ ان کی تکمیل کرتا ہے اور جو نئی چیز علم میں آتی ہے۔ ان سے اپنی طاقت کے مطابق زیادہ سے زیادہ کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ صفات جب تک اس گروہ میں تمام دوسرے انسانی گروہوں سے زیادہ رہتی ہیں۔ اس وقت تک وہ اپنی پوری نوع کا امام بنا رہتا ہے۔ اور امامت کا جلیل القدر منصب اس کے شایانِ شان ہوتا ہے۔

اور جب اس دورِ عروج کے بعد اس گروہ کے زوال کا وقت آتا ہے۔ تو وہ تھک کر اپنے کئے ہوئے کام کو کافی سمجھ کر مشاہدہ سے مزید معلومات حاصل کرنے اور فراوسے مزید نتائج اخذ کرنے کی کوشش چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس کا تمام سرمایہ

علمی صرف سمع سے حاصل شدہ معلومات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب اس کے لئے علم کے معنی صرف جاننے کے ہو جاتے ہیں۔ کہ پہلے جو معلومات حاصل کی گئی تھیں۔ اور جو نتائج اخذ کئے گئے تھے وہ کیا تھے۔ اب وہ اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ کہ جو علم پہلے حاصل کیا جا چکا ہے۔ وہ کافی ہے۔ اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں۔ پہلے جو نتائج اخذ کئے جا چکے ہیں وہ صحیح ہیں۔ ان میں کسی اصلاح و ترقی کا موقع نہیں۔ پہلے جتنی تعمیر ہو چکی ہے۔ مکمل ہے۔ نہ اس میں ترمیم ہی کی جا سکتی ہے۔ اور نہ اس سے آگے مزید تعمیر ہی ممکن ہے اس مرحلہ پر پہنچ کر یہ گروہ خود امامت سے ہٹ جاتا ہے اور نہ ہٹنا چاہے تو زبردستی ہٹا دیا جاتا ہے۔ ؎

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا

جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے!

پھر جو دوسرا گروہ مزید اکتساب علم، مزید اخذ نتائج اور مزید تعمیر حیات کا عزم لے کر آگے بڑھتا ہے۔ امامت و قیادت اس کا حصہ ہوتی ہے۔ اور وہ صاحب جو پہلے امام تھے۔ اب مقتدی بنتے ہیں۔ جو پہلے مطاع و متبوع تھے۔ اب مطیع و تابع بنتے ہیں۔ جو پہلے جیتے جاگتے علم کے مالک اور دنیا کے استاد بنے ہوئے تھے۔ اب عجائب خانہ، آثار قدیمہ میں بھیج دئے جاتے ہیں۔ تاکہ بیٹھے علوم اوائل کی تشریح کرتے رہیں۔

امامت کا حصول

ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن
شیخ و مُلا کو بُری لگتی ہے درویش کی بات!

امامت خواہ وہ آگ کی طرف چلانے والی ہو یا جنت کی طرف۔ بہرحال اس گروہ کا حصہ ہے۔ جو سمع، بصر اور فواد کو تمام انسانی گروہوں سے بڑھ کر استعمال کرے۔ یہ انسان کے حق میں اللہ تعالیٰ کا بنایا ہُوا اٹل ضابطہ ہے۔ اور اس میں کوئی رو رعائت نہیں ہے۔ کوئی گروہ خدا شناس ہو یا ناخدا شناس بہرحال وہ یہ شرط پوری کرے گا۔ تو دنیا کا امام بن جائے گا۔ اور نہ کرے گا تو مقتدی ہی نہیں بلکہ اکثر حالات میں مطیع بھی بننے سے نہ بچ سکے گا۔ "خسرۃ الدنیا والآخرۃ" کا مصداق بن کر رہ جائے گا۔

مسلمانوں کو جس چیز نے امامت کے منصب سے گرایا۔ اور ناخدا شناس گروہ اہلِ مغرب کو اس پر لا بٹھایا۔ وہ دراصل یہی ضابطہ ہے۔ آپ کے ہاں مدت ہائے دراز سے علم کی جو حالت تھی اس میں بصر اور فواد دونوں معطل تھے۔ اور

سمع کا کام بھی صرف پہلے کی حاصل شدہ معلومات فراہم کرنے تک محدود تھا۔ بہ خلاف اس کے ناخدا شناس یورپ علم کے میدان میں آگے بڑھا۔ اس نے سمع سے بھی آپ سے بڑھ کر کام لیا۔ اور بصر و فواد کا کام تو پچھلی ڈھائی تین صدیوں میں تمام تر اس نے انجام دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا اور یہی ہوا کہ وہ امام بن گئے اور آپ مقتدی بن کر رہ گئے۔ آپ کی دینی تعلیم کے تمام مراکز ابھی تک اپنی اس غلطی پر اڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں علم محض علوم اوائل کے پڑھانے تک محدود ہے۔ اگر انہوں نے کسی قدر اصلاح کی طرف قدم بڑھایا۔ تو اس کا حاصل بھی صرف اس قدر ہے۔ کہ سمع کا دائرہ حال کی معلومات تک بڑھا دیا جاتے۔ بصر اور فواد پھر بھی معطل کے معطل ہی رہے۔ اس علم کا فائدہ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ہو سکتا ہے۔ تو وہ یہی ہے۔ کہ آپ گھٹیا قسم کے نہ سہی، بڑھیا قسم کے مقتدی بن جائیں۔ امامت بہر حال آپ کو نہیں مل سکتی۔ حالانکہ دنیا کی واحد خدا شناس جماعت ہونے کی وجہ سے آپ پر جو فرض عائد ہوتا ہے۔ اس کو آپ انجام نہیں دے سکتے۔ جب تک کہ آپ ناخدا شناس لوگوں سے دنیا کی امامت کا منصب چھین کر خود اس پر قبضہ نہ کریں۔ اور اس کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ آپ مجرد سماعی علم پر قناعت کا خیال چھوڑ دیں۔ اور بصر و فواد سے نہ صرف کام لیں۔ بلکہ اس میں دنیا کے تمام گروہوں پر فوقیت لے جائیں ؎

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں!

ناخدا شناس یورپ خدا سے بغاوت اور طغیان کی بنا پر دنیا کی امامت کر رہا ہے۔ اور آگ کی طرف ساری دُنیا کو لے جا رہا ہے۔ وہ محض ایک انسانی گروہ ہونے کی حیثیت سے سب کی قیادت کرنی چاہتا ہے۔ برخلاف اس کے آپ ایک خدا شناس گروہ انسانی ہیں۔ آپ کے مسلک کی بنیاد اطاعت باللہ پر ہے۔ آپ کے ایمان کی رو سے آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے۔ کہ نہ صرف خود آگ کے راستے سے بچ کر جنّت کے راستے پر جائیں۔ بلکہ دُنیا کو بھی اسی راستے پر چلائیں اور یہ فرض آپ انجام نہیں دے سکتے۔ جب تک کہ آپ ان سے امامت چھین کر خود امام نہ بنیں۔ ناخدا شناسی کی امامت خواہ کسی کی ہو۔ وہ اسی طرح مٹا دینے کے قابل ہے جس طرح فرنگی کی اور مطلوب بالذات دراصل وہی امامت ہے۔ جس کی بنیاد خداشناسی پر ہو۔ خواہ اس کے علمبردار عربی ہوں یا ایرانی اور ہندی ہوں یا پنجابی۔ ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن

گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان!

کسی امامت کے داعی الی الجنّۃ یا داعی الی النّار ہونے کا مدار بالکل اس کے خداشناس یا ناخداشناس ہونے پر منحصر ہے۔ جب کوئی ایسا گروہ جو خداشناس نہ ہو۔ اپنے علمی اجتہاد کی بدولت دنیا کا امام بن جاتا ہے۔ تو وہ تمام سمعی اور بصری معلومات کو اسی نقطہ نظر سے جمع کرتا ہے۔ اور اسی نقطہ نظر

کے مطابق انہیں مرتب کرتا ہے۔ کہ اس کائنات کا کوئی خدا نہیں ہے انسان محض ایک غیر مسئول (Irresponsible) ہستی ہے۔ دنیا کی جو چیزیں اس کے لئے مسخر ہیں۔ نہ سب اس کی ملک ہیں۔ جن سے کام لینے کا مقصد اور طریقہ متعین کرنے ہیں وہ خود مختار محض ہے۔ اور اس کی تمام سعی دجہد کا منتہائے مقصود اس کے سوا کچھ نہیں، کہ اپنی خواہشات نفس کی خدمت کرے۔ معلومات کے اس اساس پر مرتب ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ حکمت نظری اور حکمت عملی دونوں کا نشوونما خدا پرستی کی بالکل مخالف سمت میں ہوتا ہے۔ یہی حکمت تمام دنیا کے قلوب و اذہان پر چھا جاتی ہے۔ اسی سے مادہ پرستانہ اخلاقیات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی پر انسان اور انسان کے درمیانی تعلق کے تمام ضابطے بنتے ہیں۔ اور فی الجملہ ساری انسانی زندگی کا بہاؤ اس راستے کیطرف چل پڑتا ہے۔ جس کی آخری منزلوں پر پہنچ کر اس دنیا ہی سے عذابِ جہنم کی ابتدا ہو جاتی ہے ؎

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے سلطانی بھی عیّاری!

یہ ناخدا شناس حکمت جب تک دنیا کے افکار، اخلاق، تمدن اور ہر چیز پر چھائی رہتی ہے۔ خدا شناسی کے نقطۂ نظر اور اس کے افکار و انکار کے لئے زمین و آسمان کے درمیان کوئی جگہ نہیں رہتی۔ لوگوں کے سوچنے کا انداز اس کے خلاف

ہوتا ہے۔ طبائع کی افتاد اور مزاجوں کی پسند اس کے برعکس ہوتی ہے اخلاق کے سارے اصول اور قدر و قیمت کے سارے معیار اس سے منحرف ہو جاتے ہیں زندگی کے تمام ضابطے اور انسانی سعی و عمل کے سارے ہنگامے اسکو اپنے درمیان جگہ دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اور اس صورت حال میں صرف یہی نہیں ہوتا۔ کہ خدا پرستی کے مسلک کی ہر چیز دنیا میں نامقبول اور نامعقول ہو کر رہ جاتی ہے۔ بلکہ خود وہ لوگ جو اس مسلک کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ فی الواقع اسکی پیروی کر نہیں سکتے۔ زندگی کے دریا کا بہاؤ زبردستی کھینچکر ان کو اپنے راستے پر لے جاتا ہے۔ اور اس کے خلاف زیادہ سے زیادہ کشمکش وہ بس اتنی ہی کر سکتے ہیں کہ سر کے بل بہنے کی بجائے احتجاجاً پاؤں کے بل بہیں۔ ؎

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک

نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ!

جو گروہ خیالات کے میدان میں امام بنتا ہے۔ اور کائناتِ فطرت کی طاقتوں کو اپنے علم سے مسخر کرکے ان سے کام لیتا ہے۔ اس کی امامت صرف خیالات ہی کے عالم تک محدود نہیں رہتی۔ بلکہ زندگی کے پورے دائرہ پر چھا جاتی ہے۔ زمین پر اس کا تسلّط ہوتا ہے۔ رزق کی کنجیاں اس کے قبضے میں ہوتی ہیں حاکمانہ اختیارات اسے حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے انسانی حیات اجتماعی کا سارا کاروبار اس ڈھنگ اور اس نقشے پر چلنے لگتا ہے۔ جس پر وہ گروہ اپنی ذہنیت

اور اپنے خیالی زاویۂ نظر کے مطابق اسے چلانا چاہتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے۔ کہ
اگر وہ گروہ جس کو یہ تسلّط دنیا اور اس کے معاملات پر حاصل ہے۔ خدا سے
پھرا ہوا ہو۔ تو اس کے حیطہ اقتدار میں رہتے ہوئے کوئی ایسا گروہ پنپ نہیں
سکتا۔ جو خدا کی طرف پھرنا چاہتا ہو۔ مثال کے طور پر جس گاڑی میں آپ بیٹھے ہوئے
ہیں۔ اگر اس کا ڈرائیور اسے کلکتہ کی طرف لے جا رہا ہو۔ تو آپ کراچی کی طرف
جا ہی کب سکتے ہیں۔ چار و ناچار آپ کو اسی طرف جانا پڑے گا۔ جدھر ڈرائیور
جانا چاہتا ہے۔ آپ بہت بگڑیں گے تو اتنا کرلیں گے۔ کہ اسی گاڑی میں بیٹھے
ہوئے اپنا رُخ کلکتہ سے کراچی کی طرف پھیر لیں۔ اور برضا و رغبت نہ سہی کشاں
کشاں اس منزل پر جا پہنچیں جو آپ کی منزلِ مقصود کے عین مخالف سمت میں
واقع ہے۔ یہی صورت حال فی الواقع اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے لئے
درپیش ہے۔ ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا!

امامت کی صورت

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر، ایسے امام سے گذر!

جب مسلمانوں کے علمی انحطاط کے بعد یورپ نے علم کے میدان میں پیش قدمی کی۔ تو ناگزیر اسباب نے اس کی نگاہ کا زاویہ خدا سے بیزاری کیطرف پھیر دیا۔ اسی نقطۂ نظر سے اس نے تمام سمعی معلومات کو جمع کیا۔ اسی نقطۂ نظر سے اس نے آثارِ کائنات کا مشاہدہ کیا۔ اسی نقطۂ نظر سے اس نے معلومات کو مرتب کر کے نتائج اخذ کئے۔ اسی نقطۂ نظر سے اس نے زندگی کے مقاصد، اخلاق کے اصول، تمدن کے ضوابط، اور انفرادی و اجتماعی برتاؤ کے ڈھنگ متعین کئے۔ اور اسی نقطۂ نظر سے اس نے ان تمام قوتوں کے مصرف تجویز کئے۔ جو اسے تحقیق و اجتہاد کی بدولت حاصل ہوئی تھیں۔ پھر جب اس علم کے زور پر وہ اٹھا تو ایک طرف زمینیں کی زمینیں اور قومیں کی قومیں اس کے آگے مسخر ہوتی چلی گئیں۔ اور دوسری طرف وہی علم، وہی ذہنیت، وہی مقاصد، وہی

غایات، وہی فکری ساخت، وہی اخلاقی روش، وہی تمدنی قواعد و ضوابط غرض وہی سب کچھ جو اس امام غالب کے پاس تھا۔ تمام دنیا پر چھا گیا۔ اب یہ حال ہے۔ کہ ایک بچہ جب سے ہوش سنبھالتا ہے۔ اسی وقت سے اس کے ذہن اور اس کی زندگی کی تعمیر اس نقشے پر ہونے لگتی ہے۔ جو یورپ کی امامت نے بتایا ہے سمعی معلومات اسی ترتیب سے اس کے دماغ میں اترتی ہیں۔ مشاہدہ کے لئے وہی نقطۂ نظر اسے ملتا ہے۔ نتائج اخذ کرنے کی ساری تربیت اسی طرز پر اسے حاصل ہوتی ہے۔ حق اور باطل، صحیح اور غلط، مقبول اور مردود کی تعیین کے لئے وہی معیار اسے میسّر آتا ہے۔ اخلاق کے وہی اصول، زندگی کے وہی مقاصد اور سعی و عمل کے وہی راستے اس کے سامنے روشن ہوتے ہیں۔ اور اپنے گرد و پیش زندگی کا سارا کارخانہ اسی ڈھنگ پر اسے چلتا ہوا ملتا ہے۔ اور جب وہ اسطرح پروان چڑھنے کے بعد چراگاہِ حیات میں حصہ لینے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ تو چونکہ یہی ایک مشین دُنیا میں چل رہی ہے۔ اور کوئی دوسری مشین چلنے والی موجود نہیں ہے اسلئے اسی کا پرزہ اس کو بن جانا پڑتا ہے۔ اور وہ ہر چہ در کان نمک رفت نمک شد" کا مصداق بن جاتا ہے۔ ؎

انسان کا نصیب نہ انساں کے بس میں ہو
انسانیت نہ پیرو شیطاں کے بس میں ہو!

ناخدا شناس تہذیب و تمدن کے اس کامل تسلط میں اوّل تو یہی سخت مشکل ہے

کہ خدا پرستانہ نظریۂ حیات، مقصدِ زندگی اور اصولِ اخلاق کو دلوں اور دماغوں میں راہ مل سکے۔ کیونکہ علوم و فنون کی ساری ترتیب اور زندگی کی پوری روش اس کے بالکل مخالف سمت میں پھری ہوئی ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگ ایسے بھی نکل آئیں۔ جن کے ذہن میں یہ تخم جڑ پکڑ لے۔ تب بھی گرد و پیش کی پوری فضا اس کو غذا دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کو نہ کہیں علوم سے تائید ملتی ہے۔ نہ زندگی کے بنے اور جمے ہوئے نقشے اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ نہ دُنیا کے چلتے ہوئے معاملات ہی میں کہیں اسکی جگہ نظر آتی ہے جسقدر معلومات گذشتہ پانسو برس کی مدّت میں انسان کو حاصل ہوئی ہیں۔ ان کو مرتب کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا سارا کام ناخدا شناس لوگوں نے کیا ہے۔ خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے انکی ترتیب کا اور اخذ نتائج کا کوئی کام ہوا ہی نہیں۔ فطرت کی جو طاقتیں اس دوران میں انسان کے لئے مسخر ہوئیں۔ اور قوانین طبعی کی مزید دریافت سے جو فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اُن سے بھی خدا پرستوں نے نہیں بلکہ خدا کے باغیوں نے کام لیا۔ اسلئے ناگزیر تھا۔ کہ تمدن انسانی میں ان سب کا مصرف وہی مقرر ہوتا۔ جو ان کے مقاصد زندگی اور اصولِ اخلاق کے مناسب حال تھا۔ اسی طرح اجتماعی معاملات کی تنظیم کے جتنے نظری خاکے اور عملی طریقے اس دوران میں سوچے۔ اور عملاً چلائے گئے۔ ان سب کے سوچنے اور چلانے والے وہ دماغ اور وہ ہاتھ نہ تھے۔ جن پر خدا پرستی کا مسلک فرمانروا ہوتا۔ بلکہ وہ تھے۔ جو خدا کی اطاعت سے

منحرف تھے۔ اس لئے نظریات اور عملیات کے میدان پر آج سالہا سال سے
وہی نقشے چھائے ہوئے ہیں۔ جو انہوں نے بنائے ہیں۔ اور ایسا کوئی نقشہ جو خدا
پرستانہ مسلک کی بنا پر بنا ہو۔ عملاً تو کیا موجود ہوتا۔ نظریے کی شکل میں بھی ایسی
تفصیلی ترتیب کے ساتھ مرتب نہیں ہے۔ جو آج کے حالات سے ربط رکھتا ہو۔ اور
جس میں آج کے مسائل حیات کا پورا پورا حل مل سکے۔ اب اگر اس مسلک پر اعتقاد
رکھنے والا کوئی شخص راہب بن کر دُنیا اور اُس کی زندگی سے الگ تھلگ کسی گوشے
میں جا بیٹھے۔ اور پانسو برس سے پہلے کی فضا اپنے اوپر طاری کر لے۔ تب تو بات
دوسری ہے۔ ورنہ اس دُنیا کے معاملات میں ایک زندہ انسان کی حیثیت سے
حصہ لینے کی صورت میں تو قدم قدم پر اس کے لئے مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ اپنے
مسلک میں نیک نیت اور صحیح الاعتقاد ہونے کے باوجود بارہا وہ نادانستہ ان
فکری اور عملی راہوں پر چل پڑتا ہے۔ جو اس کے مسلک سے بالکل مختلف ہیں۔ نئی
معلومات جب اس کے سامنے آتی ہیں۔ تو اس کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے۔ کہ
حقائق (Facts) کو ان ناخدا شناس لوگوں کے نقطۂ نظر اور اخذ کردہ نتائج
سے الگ کر سکے۔

جنہوں نے ان کی دریافت، ترتیب اور استنباط کا سارا کام انجام دیا ہے اس لئے
اکثر وہ اس طرح حقائق کے ساتھ ان کے نظریات اور نتائج کو بھی ہضم کر جاتا ہے کہ اسے اس امر کا شعور
تک نہیں ہوتا کہ امرت کے ساتھ کتنا زہر اس کے اندر اُتر گیا۔ اسی طرح زندگی کے
عملی معاملات سے جب اس کو واسطہ پیش آتا ہے۔ تو وہ سخت مشکل

میں پڑ جاتا ہے کہ کونسی راہ اختیار کرے۔ بہت سے اجتماعی نظریات جو فی الاصل
اس مسلک کے خلاف ہیں۔ اس کے دل و دماغ پر زبردستی چھا جاتے ہیں کیونکہ دنیا
میں ہر طرف چلن ہی ان کا ہے۔ بہت سے عملی طریقوں کو غلط سمجھنے کے باوجود محض
اس بنا پر وہ اختیار کرتا ہے کہ ان سے ہٹ کر وہ کوئی دوسری راہ سوچ نہیں سکتا۔
اور بہت سی غلط راہوں پر اسے مجبوراً اسلئے چلنا پڑتا ہے کہ ان پر چلے بغیر کوئی
چارہ کار ہی نہیں ہے۔ ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے، کہ اسلام ہے آزاد!

امامت کا انقلاب

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
اُمیدِ مردِ مومن ہے، خدا کے رازدانوں میں!

ناخدا شناس آئمہ کی امامت میں رہ کر خدا شناسی و خدا پرستی کا مسلک زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہذا ہر مسلمان جو اس مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کا نام لیوا ہو۔ اس کے عین ایمان و اعتقاد کا اقتضاء یہ ہے۔ کہ اس امامت کو مٹانے اور خدا شناس امامت کو دنیا میں قائم کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ جو نظام تعلیم محض پرانے سمعی علوم کی حد تک محدود ہے۔ اس میں یہ طاقت ہرگز نہیں ہے۔ کہ امامت میں اتنا بڑا انقلاب کرنے کے لئے آپ کو تیار کر سکے۔ لہذا اگر آپ چاہتے ہیں۔ کہ دنیا کی امامت و قیادت کی باگیں علماء اسلام کے ہاتھ میں آجائیں اور وہ دنیا جو آج آگ کیطرف چلانے والے آئمہ کے پیچھے چل رہی ہے جنت کی طرف بلانے والے آئمہ کی رہبری قبول کرنے کے لئے مجبور ہو جائے۔ تو اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے آپ کو مکمل انقلابی اصلاحات کیلئے تیار ہونا پڑیگا۔

اور اپنے سارے نظامِ تعلیم کو ادھیڑ کر از سرِ نو ایک دوسرا ہی نظامِ تعلیم بنانا ہوگا۔

جو نظامِ تعلیم تمام علوم کو اسی ترتیب اور اسی زاویۂ نظر سے پڑھاتا ہے ۔ جو ناخدا شناس آئمہ کی ترتیب اور زاویۂ نظر ہے۔ اور جو اس تمدّنی مشین کا پرُزہ بننے کے لئے انسانوں کو تیار کرتا ہے۔ جو آئمہ ضلال نے بنائی ہے۔ وہ دراصل ارتداد کا مجرّب نسخہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی فریب نہیں ہو سکتا۔ کہ اس نوعیت کی کسی تعلیم گاہ پر مسلم یونیورسٹی یا اسلامیہ کالج یا اسلامیہ ہائی سکول کے الفاظ کا اطلاق کیا جائے۔ اور اس تعلیم کے ساتھ دینیات کے کسی کورس کو الگ سے لاکر جوڑ دینا پچانوے فیصدی تو بالکل ہی لاحاصل ہے۔ اور پانچ فیصدی فائدہ اگر اس سے حاصل ہو بھی سکتا ہے۔ تو وہ بیش از یں نیست۔ کہ لوگ کچھ مدت تک کفر کے راستے پر خدا کا نام لیتے ہوئے چلتے رہیں۔ ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ!

اصلاحِ تعلیم کا یہ لائحہ کہ علومِ اسلامی کے ساتھ نئے علوم کا جوڑ لگایا جائے یہ بھی امامت میں انقلاب کرنے کے لئے آپ کو تیار نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ فلسفہ، سائنس، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علوم جو اسوقت مدوّن و مرتب صورت میں آپ کو ملتے ہیں۔ وہ سب کے سب ناخدا شناس لوگوں کی فکر و تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ اور ان کی ترتیب و تدوین میں اسی گروہ کا نقطۂ نظر اس

طرح پیوست ہے۔ کہ حقائق واقعیہ کو نظریات اور اوہام و تعصبات اور اہواء و جیانات سے الگ پہچان لینا اور خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے ان کو بطور خود مرتب کر کے دوسرے نظریات قائم کرنا نہ ہر طالب علم کے بس کی بات ہے نہ ہر استاد کے بس کی۔ اب اگر آپ ایک طرف پرانے علوم کو پرانی ترتیب کے ساتھ اور نئے علوم کو اس خاص ترتیب کے ساتھ جو اس وقت پائی جاتی ہے ملا کر پڑھائیں گے۔ تو ان دو متضاد طاقتوں کے میل سے عجیب عجیب قسم کے مرکبات پیدا ہوں گے۔ کوئی پرانے علوم سے مغلوب ہوگا۔ تو مولوی بن جائے گا کوئی نئے علوم سے مغلوب ہوگا۔ تو دہریت کی طرف چلا جائے گا۔ بلکہ کامریڈیت تک جا پہنچے گا۔ کوئی دونوں کے درمیان تذبذب کی حالت میں مہمل ہو جائیگا۔

بہت کم آدمی اس نظام تعلیم سے ایسے نکل سکتے ہیں۔ جو دونوں قسم کے علوم کو جوڑ کر کوئی صحیح مرکب بنا سکیں۔ اور ان کا بھی اس قدر طاقتور ہونا بہت مشکل ہے۔ کہ اٹھ کر خیالات اور زندگی کے دھارے کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دیں۔

پس اگر آپ ان مندرجہ بالا نظریوں کو درست تسلیم کرتے ہیں۔ تو پھر امت میں انقلاب کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔ کہ ان تینوں نظامات تعلیمی سے ہٹ کر ایک بالکل نیا نظام تعلیم بنایا جائے۔ جس کا نقشہ ابتدائی تعلیم سے لیکر انتہائی مدارج تک تینوں سے مختلف ہو اور اس سے قوم کی ترقی کی راہیں کھل جائیں سہ

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ‌ ‌ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

امامت کا علم

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصل سنت جز محبت ہیچ نیست

حصول امامت کے لئے جس نظام تعلیم کی ضرورت ہے۔ اس کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہو۔ کہ دینی و دنیوی علوم کی انفرادیت کو مٹا کر دونوں کو ایک جان کر دیا جائے۔ علوم کو دینی اور دنیوی دو الگ الگ قسموں میں منقسم کرنا دراصل دین اور دنیا کی علیحدگی کے تصور پر مبنی ہے۔ اور یہ تصور بنیادی طور پر غیر اسلامی ہے۔ اسلام جس چیز کو دین کہتا ہے۔ وہ دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کو اس نقطہ نظر سے دیکھنا کہ یہ اللہ کی سلطنت ہے۔ اور اپنے آپ کو یہ سمجھنا کہ ہم اللہ کی رعیت ہیں۔ اور دنیوی زندگی میں ہر طرح سے وہ رویہ اختیار کرنا جو اللہ کی رضا اور اس کی ہدایت کے مطابق ہو۔ اسی چیز کا نام دین ہے۔

اس تصور دین کا اقتضاء یہ ہے۔ کہ تمام دنیوی علوم کو دینی علوم بنا دیا جائے ورنہ اگر کچھ علوم دنیوی ہوں۔ اور وہ خدا پرستی کے نقطہ نظر سے خالی رہیں۔ اور کچھ

دوسرے علوم دینی ہوں۔ اور وہ دنیوی علوم سے الگ پڑھائے جائیں۔ تو ایک بچہ شروع ہی سے اس ذہنیت کے ساتھ پرورش پائے گا۔ کہ دنیا کسی اور چیز کا نام ہے۔ اور دین کسی اور چیز کا۔ اس کے لئے یہ دونوں دو مختلف عنصر ہوں گے۔ اور ان دونوں کے درمیان توافق پیدا کرکے ایک ایسی ہموار زندگی بنانا اس کے لئے مشکل ہوگا۔ جو اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً کی مصداق ہو سکے۔

مثال کے طور پر اگر آپ تاریخ، جغرافیہ، طبعیات، کیمیا، حیاتیات (Biology) حیوانیات (Zoology) اراضیات (Geology) ریاضی، ہیئت (Astronomy) معاشیات (Economics) سیاسیات اور دوسرے تمام علوم ایک شخص کو اس طرح پڑھاتے ہیں۔ کہ اول سے آخر تک کسی جگہ خدا کا نام نہیں آتا۔ نہ آفاق و انفس کے آثار پر اس حیثیت سے نظر ڈالی جاتی ہے۔ کہ یہ آیاتِ الٰہی ہیں۔ نہ قوانین طبعی کا ذکر اس حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ کہ یہ ایک حکیم کے بنائے ہوئے ہیں۔ نہ واقعات کی توجیہ اس حیثیت سے کی جاتی ہے کہ ان میں کسی قادر و توانا کا ارادہ کام کر رہا ہے۔ نہ عملی علوم میں اس مقصد کا کہیں نشان پایا جاتا ہے۔ کہ ان سے خدا کی رضا کے مطابق کام لینا ہے۔ نہ معاملات زندگی کی بحث میں اس ضابطہ کا کہیں بیان آتا ہے۔ جو ان کو چلانے کے لئے خدا نے بتایا ہے۔ نہ سرگزشتِ حیات میں اس کے الٰہی مبداء و غائت کی بحث کسی جگہ آتی ہے۔ تو علوم کے اس پورے مجموعہ سے اس کے ذہن میں دنیا اور

اس کی زندگی کا جو تصور پیدا ہوگا۔ وہ خدا کے تصور سے بالکل خالی ہوگا۔ ہر چیز سے
اس کا تعارف خدا کے بغیر ہوگا۔ اور ہر معاملہ میں وہ اپنا راستہ خدا اور اس کی
رضا سے الگ بنائے گا۔ پھر جب تمام شعبوں سے یہ نقطۂ نظر اور معلومات کی
یہ ترتیب لئے ہوئے ایک شعبہ میں جاکر وہ الگ سے خدا کا ذکر سُنے گا۔ اور ان
مقاصد زندگی اور ان قوانین اخلاقی اور ان ضوابط شرعی کی تعلیم حاصل کرے گا۔
جنہیں آپ دینیات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ تو اس کی سمجھ میں نہ آئے گا۔
کہ اس نقشے میں خدا کو اور اس سے تعلق رکھنے والی ان ساری چیزوں کو کہاں جگہ
دول پہلے تو اسے خدا کی ہستی کا ثبوت ہی درکار ہوگا۔ پھر وہ اس بات کا ثبوت مانگے
گا۔ کہ مجھے اس کی ہدائت درکار بھی ہے۔ اور اس کے پاس سے ہدائت آئی بھی ہے
یا نہیں۔ اور ان سب باتوں کے بعد بھی اس کے لئے اپنی دنیوی معلومات کو اس نئی
چیز کے ساتھ یکجان کرکے ایک ہمرنگ نقشہ بنانا مشکل ہوگا۔ وہ خواہ کتنا ہی پختہ
ایمان لے آئے۔ مگر بہر حال اس کے لئے دین عین اس کی زندگی نہ ہوگا۔ بلکہ زندگی
کا ایک ضمیمہ ہی بن کر رہ جائیگا۔ سے

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے !

یہ ساری خرابی دینی اور دنیوی علوم کی تقسیم کا نتیجہ ہے۔ اور یہ تقسیم بالکل اسلامی
نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔ نئے نظامِ تعلیم میں دینیات کے الگ کورس کی

ضرورت نہیں۔ بلکہ سارے کورس کو دینیات کے کورس میں تبدیل کر دینا چاہیئے۔
شروع ہی سے ہر ایک بچے کو دنیا سے اس طرح روشناس کرائیے۔ کہ گویا وہ
خدا کی سلطنت میں ہے۔ اس کے اپنے وجود میں اور تمام آفاق میں خدا کی آیات،
چھپی ہوئی ہیں۔ ہر چیز میں وہ خدا کی حکمت اور قدرت کے آثار دیکھ رہا ہے اس کا
اور ہر شے کا براہ راست تعلق خداوند عالم سے ہے۔ جو آسمان سے زمین تک
تمام معاملات دنیا کی تدبیر کر رہا ہے۔ دنیا میں جتنی قوتیں اس کو حاصل ہیں۔ اور
جو اشیا اس کے لئے مسخر ہیں۔ سب کی سب خدا نے اس کو دی ہیں۔ ان سب
سے خدا کی مرضی کے مطابق اور اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر اسے کام لینا ہے۔ اور
اپنے اس کام کی جواب دہی خدا کے سامنے اس کو کرنی ہے۔

ابتدائی مراحل میں تو کوئی دوسرا نقطۂ نظر طالب علم کے سامنے آنا ہی نہیں
چاہیئے۔ البتہ بعد کے مراحل میں تمام علوم اس کے سامنے اس طرح آنے چاہئیں
کہ معلومات کی ترتیب، حقائق کی توجیہ، اور واقعات کی تعبیر تو بالکلیہ اسلامی
نقطۂ نظر سے ہو۔ مگر اس کے مخالف تمام دوسرے نظریات بھی پوری تنقید و تنقیح
کے ساتھ اس حیثیت سے اس کے سامنے رکھ دیئے جائیں۔ کہ یہ ضَالِّیْنَ اور
مَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کے نظریات ہیں۔ اسی طرح عملی زندگی سے تعلق رکھنے والے
جملہ علوم کی بنیاد میں تو مقصدِ حیات، اصولِ اخلاق اور مناہج عمل اسلام کے
پیوست کیئے جائیں۔ اور دوسروں کے اصول اور طریقے اس حیثیت سے طالب علم کو

پڑھائے جائیں۔ کہ ان کی فکری اساس، منزلِ مقصود، اور راہِ عمل اسلام سے کتنی اور کس کس پہلو سے مختلف ہے۔ یہ طریقہ ہے، تمام علوم کو دینی علوم میں تبدیل کرنے کا۔ اور جب اس طریقہ سے تعلیم دی جائے تو ظاہر ہے۔ کہ اس میں دینیات کے لئے کسی علیحدہ کورس کی کوئی حاجت ہی پیش نہیں آسکتی۔

انسان کی ہوس نے جسے رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار!

امامت کی تعلیم

میسّر اسکو ہو سکتی ہے یہ دنیا نہ وہ دُنیا
مُسلماں ہو کے جو پابندِ قرآں ہو نہیں سکتا!

حصولِ امامت کیلئے جو نظامِ تعلیم درکار ہے۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہو۔ کہ اس میں ہر طالب علم کو مجموعہ علوم بنانے کے بعد ہر ایک کو "مولانا"، اور ہر ایک کو جملہ مسائل میں فتویٰ کا مجاز قرار دینے کا وہ طریقہ جواب تک رائج ہے ختم کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ اختصاصی تعلیم کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے۔ جو سالہا سال کے تجربات کے بعد دُنیا میں مفید پایا گیا ہے۔ انسان کا علم اب اتنی ترقی کر چکا ہے۔ اور اتنے شعبے اس میں پیدا ہو گئے ہیں۔ کہ کسی ایک شخص کا ان سب کو پڑھنا محال ہے۔ اور اگر تمام علوم میں محض معمولی سی شد بود اسے کرا دی جائے تو وہ کسی شعبۂ علم میں بھی کامل نہیں ہو سکتا۔ اس کی بجائے بہتر یہ ہے کہ پہلے آٹھ یا دس سال کا کورس ایسا رکھا جائے۔ کہ ایک بچے کو دنیا اور انسان اور زندگی کے متعلق جتنی معلومات کم سے کم حاصل ہونی ضروری ہیں۔ وہ اسکو خالص

اسلامی نقطۂ نظر سے دے دی جائیں۔ اس کے ذہن میں کائنات کا وہ تصور بیٹھ جائے۔ زندگی کا وہ خاکہ جم جائے۔ جو ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہیئے۔ عملی زندگی کے متعلق وہ تمام معلومات اسے حاصل ہو جائیں جن کی ایک آدمی کو ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ ان سب چیزوں کو ایک مسلمان کے طریقہ سے برتنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اسے اپنی مادری زبان بھی آ جائے۔ عربی زبان بھی وہ اتنی جان لے کہ آگے مزید مطالعہ میں اسے مدد مل سکے۔ اور کسی ایک یورپین زبان سے بھی واقف ہو جائے۔ تاکہ معلومات کے اس وسیع ذخیرہ سے فائدہ اٹھا سکے۔ جو ان زبانوں میں موجود ہے۔ اس کے بعد اختصاصی تعلیم کے الگ کورس ہوں۔ جن میں چھ یا سات سال کی محققانہ تربیت حاصل کر کے ایک طالب علم اس شعبۂ علم کا ڈاکٹر قرار دیا جائے۔ جس کی تعلیم اس نے حاصل کی ہے۔ مثال کے طور پر میں چند شعبوں اور ان کے طریق تعلیم کی تشریح کر دوں گا جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ میرے ذہن میں اس اختصاصی تعلیم کا کیا نقشہ ہے۔ ؎

فطرت نے باغِ دہر میں کیا کیا کھلائے گُل
غُنچوں کے دِل میں بھر کے تمنائے انقلاب!

ایک شعبہ فلسفہ اور علوم عقلیہ کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے۔ اس شعبہ میں طالب علم کو پہلے قرآن کا علم پڑھایا جائے۔ تاکہ اس ذریعہ سے وہ معلوم کرے کہ انسانی حواس سے جو چیزیں محسوس ہوتی ہیں ان کی تہ میں حقائق کی جستجو کرنے کی

کیا سبیل ہے۔ عقل انسانی کی رسائی کہاں تک ہے۔ اور کن حدود سے وہ محدود ہے۔ مجرد استدلال پر تخیلات کی بنیاد کھڑی کرنے میں کس طرح انسان واقعات اور حقیقت کی دنیا سے الگ ہو کر خیالات کی تاریک دنیا میں گم ہو جاتا ہے ما بعد الطبعی امور کے متعلق کتنا علم انسان کے لئے فی الواقع ضروری ہے۔ اس ضروری علم تک پہنچنے میں مشاہدہ (Observation) اور استقراء (Induction) سے کس طرح کام لینا چاہیئے۔ کن امور ما بعد الطبعی کا تعین ہم کر سکتے ہیں۔ کن کے متعلق ایک مجمل اور مطلق حکم سے آگے ہم نہیں بڑھ سکتے۔ اور کہاں پہنچ کر اجمال کو تفصیل سے بدلنے یا اطلاق کو تقیید میں تبدیل کرنے کی کوشش نہ صرف بے بنیاد ہو جاتی ہے بلکہ انسان کو تخیلات لاطائل کی بھول بھلیاں میں بھٹکا دیتی ہے۔ اس بنیاد کو مستحکم کر لینے کے بعد طالب علم کو تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کرایا جائے۔ اور یہاں قرآنی فلسفہ کی مدد سے اس کو تمام مذاہب فلسفہ کی سیر کرا دی جائے تاکہ وہ خود دیکھ لے کہ حقائق تک پہنچنے کے جو ذرائع انسان کو دیئے گئے تھے۔ ان سے کام نہ لے کر یا ان سے غلط طریقہ پر کام لے کر کس طرح انسان بھٹکتا رہا ہے کس طرح اس نے اوہام کو حقیقت سمجھا۔ اور اس سے کسطرح اس کی زندگی متاثر ہوئی۔ اور کس طرح اس نے اپنی پہنچ سے ماوراء چیزوں کے متعلق رجماً بالغیب حکم لگائے۔ اور اس کے کیا اثرات زندگی پر مترتب ہوئے کس طرح اس نے اپنے حواس اور اپنی عقل کی مدد کا تعین کیئے بغیر ان حقیقتوں کا تعین کرنے میں اپنا وقت ضائع کیا جن کا تعین اس کے بس کی چیز ہی نہ تھا کہاں

ہندو فلسفیوں نے ٹھوکر کھائی۔ کہاں سے یونانی فلسفہ بھٹکا۔ کہاں مسلمان فلاسفر قرآن کی بتائی ہوئی راہوں سے ہٹ کر نکل گئے۔ متکلمین کے مختلف اسکولوں نے صدیوں تک جن مسائل پر بحثیں کیں۔ ان میں قرآن کی رہنمائی سے کہاں کہاں اور کتنا کتنا تجاوز تھا۔ فلسفیانہ تصوف کے مختلف مذاہب نے مجمل کو مفصل اور مطلق کو مقید بنانے کی کس طرح کوششیں کیں۔ اور وہ کس قدر غلط تھیں۔ یورپ میں فلسفیانہ تفکر نے کیا کیا راہیں اختیار کیں۔ ایک ہی حقیقت کی جستجو میں کتنے مختلف مذہب بن گئے۔ ان مختلف مذاہب میں حق کتنا ہے اور باطل کی آمیزش کتنی ہوئی۔ اور کن راہوں سے آئی۔ کون سے مابعد الطبعی تصورات ہیں جنہوں نے یورپ میں جڑھ پکڑ لی ہے۔ ان سے اخلاق و اعمال پر کیا اثرات مترتب ہوئے ہیں۔ اور اگر کتاب اللہ کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھایا جاتا۔ تو فضول دماغی کاوشوں میں وقت ضائع کرنے اور غلط بنیادوں پر زندگی کی تعمیر کرنے سے کس طرح دنیا بچ سکتی تھی۔ اس تمام مطالعہ کے بعد طالب علم اپنی تحقیق کے نتائج مرتب کرے اور جب اہل علم کی جرح و تنقید کے بعد وہ اپنا کامل الفن ہونا ثابت کردے تو اس کو فلسفہ میں فضیلت کی سند دے کر چھوڑ دیا جائے۔ ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن

قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآں!

ایک دوسرا شعبہ تاریخ کا ہونا چاہیے۔ جس میں قرآن کا فلسفہ تاریخ، مقصد مطالعہ

تاریخ، اور طرز مطالعۂ تاریخ طالب علم کے ذہن نشین کرایا جائے۔ تاکہ اس کے قلب سے تمام تعصبات نکل جائیں۔ وہ حقائق کو بے رنگ نگاہ سے دیکھے اور ان سے بے لاگ نتائج اخذ کرنے کے لئے مستعد ہو جائے۔ نوع انسانی کی سرگزشت اور تہذیب انسانی کے نشوو ارتقاء کا مطالعہ کر کے انسان کی فلاح و خسران اور سعادت و شقاوت اور عروج و زوال کے مستقل اصول مستنبط کرے۔ مداولت ایام بین الناس جس ڈھنگ پر اور جس ضابطے کے مطابق ہوتی ہے اسے معلوم کرے۔ جو اوصاف انسان کو اوپر اٹھاتے ہیں۔ اور جو اسے نیچے گرا دیتے ہیں۔ ان سے واقف ہو۔ اور خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لے۔ کہ کس طرح فطرت کا ایک خط مستقیم ابتداء سے آج تک سیدھا کھینچا ہوا نظر آتا ہے جو انسان کی ترقی کا اصل راستہ ہے۔ اس خط سے ہٹ کر جو کبھی دائیں یا بائیں جانب دور نکل گیا۔ اسے یا تو تھپیڑ کھا کر اسی کی طرف پلٹنا پڑا۔ ورنہ پھر ایسا پھینکا گیا۔ کہ اس کا پتہ نشان نہ ملا۔ اس طرز مطالعہ سے جب طالب علم کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ خدا کا قانون کس قدر بے لاگ ہے۔ اور کیسی غیر جانبداری کے ساتھ اس نے قوموں سے معاملہ کیا ہے۔ تو کوئی قوم بھی نہ اسکی چہیتی رہے گی اور نہ کسی کے خلاف اس کے دل میں نفسانی عداوت کا جذبہ رہے گا۔ جس قوم کے کارنامے پر بھی وہ نظر ڈالے گا بے لاگ طریقہ پر ڈالے گا۔ اور فلاح و خسران کے ابدی اصولوں کی کسوٹی پر کس کر کھرے کو الگ اور کھوٹے کو الگ کر کے سامنے رکھ دیگا۔ اس تربیت ذہنی

کے بعد اسے تاریخی دستاویزوں اور آثارِ قدیمہ اور ماخذِ اصلیہ سے بطورِ خود نتائج اخذ کرنے کی مشق کرائی جائے اور اتنا تیار کر دیا جائے۔ کہ وہ جاہل مؤرخین کے چڑھائے ہوئے ردّوں سے اصل حقائق کو الگ کر کے خود بے لاگ رائیں قائم کر سکے۔

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے!

ایک اور شعبہ علومِ عمران (Social Sciences) کا ہونا چاہیئے۔ اسمیں پہلے قرآن اور احادیث سے انسانی تمدّن کے بنیادی اصول بتائے جائیں۔ پھر تفصیل کے ساتھ اصول سے فروع کا استنباط کر کے اور انبیاء کی رہنمائی میں جو تمدّن بنے تھے۔ ان کے نظائر سے استشہاد کرتے ہوئے یہ بتایا جائے۔ کہ ان قواعد اصلیہ (Fundamental principles) پر کس طرح ایک صالح نظامِ معاشرت، نظامِ معشیت، نظامِ سیاست، تدبیرِ مملکت، اور تعلقات بین الاقوامی کی عمارت اٹھتی ہے۔ پھر یہ بتایا جائے کہ کس طرح انہی اصولوں پر اس عمارت کی مزید توسیع ہو سکتی ہے۔ اور اجتہاد سے توسیع کا نقشہ مرتب کرنے کا کیا طریقہ ہے اور انسانی علم کی ترقی سے جو نئی قوتیں دریافت ہوتی ہیں۔ اور تمدّن کے فطری نشوونما سے جو نئے طرزِ عمل پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب کو اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اس صالح تمدّن میں جذب کرنے اور اپنے اپنے ٹھیک مقام پر رکھنے کی

کیا صورت ہے۔ اس کے ایک طرف طالب علم کو پچھلی قوموں اور مسلمانوں کی تمدنی تاریخ کا مطالعہ کرایا جائے تاکہ وہ دیکھے۔ کہ تمدن کے ان اساسی اصول اور الہٰی جادۂ کے قریب رہنے اور ان سے انحراف کرنے سے کیا نتائج رونما ہوئے ہیں۔ اور دوسری طرف اسے دورِ جدید کے سیاسی، معاشی، اجتماعی نظریات و عملیات کا تنقیدی مطالعہ کرایا جائے۔ تاکہ وہ یہ بھی دیکھ لے۔ کہ انسان نے الٰہی ہدایت سے بے نیاز بن کر بطورِ خود اپنی زندگی کے لئے جو راستے تجویز کئے ہیں۔ وہ کہاں تک اس کے لئے موجبِ سعادت و شقاوت ہیں۔ ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

سائنس کی مختلف شاخوں کے لئے چند شعبے علیحدہ ہونے چاہئیں۔ جن میں قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھا کر نہ صرف، اب تک کی جمع شدہ سائنٹیفک معلومات کا جائزہ لیا جائے۔ بلکہ آثارِ فطرت کے مزید مشاہدے اور قوانینِ فطرت کی مزید دریافت کا کام بھی، انہی خطوط پر کیا جائے جو قرآن نے کھینچ دئے ہیں۔ اگرچہ یہ کتاب سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ نہ اس کے موضوع کا براہِ راست سائنس سے کوئی تعلق ہے لیکن چونکہ یہ اسی مصنف کی تصنیف ہے۔ جس نے کائنات کو تصنیف کیا ہے۔ اور وہ مصنف اپنی ایک کتاب سے دوسری کتاب میں جگہ جگہ استدلال و استشہاد کا کام لیتا ہے۔ اسلئے اس کے گہرے مطالعہ سے سائنس کے ایک طالب علم کو

نہ صرف نظام کائنات کا بنیادی فارمولا معلوم ہو جاتا ہے۔ بلکہ قریب قریب ہر شعبۂ علم میں اسے ایک صحیح نقطۂ نظر آغاز (Starting Point) اور تلاش و تجسس کے لئے ایک صحیح رُخ (Direction) بھی ملتا ہے۔ یہ وہ شاہ کلید (Master Key) ہے جس سے تحقیق کا سیدھا راستہ صاف کھل جاتا ہے جس کی مشکل کشائی سے اگر آدمی کام لے۔ تو اس کا بہت سا وقت گتھیوں کے سلجھانے اور سلجھاتے سلجھاتے خود الجھ جانے میں نہ ضائع ہو۔ موجودہ سائنس کی گمراہی کا ایک بڑا سبب یہ ہے۔ کہ وہ حقائق واقعیہ کے مشاہدے کی حد تک تو ٹھیک رہتا ہے مگر جب ان حقائق کو جوڑ کر ان سے نظریات بناتا ہے۔ تو کائنات فطرت کے مبداء و غائت سے ناواقف ہونے کے باعث ٹھوکریں کھاتا چلا جاتا ہے۔ اور اس سے نہ صرف بہت سی انسانی قوت ضائع ہوتی ہے۔ بلکہ ان غلط نظریات کو جب انسانی تمدن میں جذب کر کے عملیات کی بنیاد اٹھائی جاتی ہے۔ تو وہ فسادِ تمدن کی موجب ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کی رہنمائی میں جب ایک مسلم سائنٹسٹ ثابت شدہ حقائق کو نظریات سے الگ کر کے مرتب کرے گا۔ اور مزید حقائق دریافت کر کے ان سے بہتر نظریات نکال کر بتائے گا تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ دنیا ان سائنٹیفک گمراہیوں کو چھوڑنے پر مجبور نہ ہو جائے۔ جن میں آج وہ مبتلا ہے۔ ~~

نظر بہ ہر چہ انگندیم واللہ
نیاید در نظر مارا جز اللہ!

جن علوم کو اس وقت علوم دینی کہا جاتا ہے۔ ان کے لئے بھی الگ الگ شعبے مخصوص ہونے چاہئیں۔ مثلاً ایک شعبہ قرآن کے تحقیقی مطالعہ کا ہو جسمیں پچھلے مفسرین کے کام کا جائزہ لینے کے بعد آگے مزید کام کیا جائے۔ مختلف پہلوؤں سے قرآن کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کی جائے۔ اور علوم انسانی کے تمام شعبوں سے استفادہ کرکے قرآن میں مزید بصیرت حاصل کی جائے۔ اسی طرح ایک شعبہ علم حدیث کا ہونا چاہیئے۔ جس میں قدیم محدثین کے کام سے پورا فائدہ اٹھانے کے بعد حدیث میں تحقیق، تنقید، ترتیب معلومات اور اخذ نتائج کا مزید کام کیا جائے۔ دورِ سعادت کے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیلات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی جائیں۔ اور ان سے وہ نتائج اخذ کئے جائیں۔ جو اب تک ہمارے علم سے مخفی ہیں۔ ایک شعبہ قانون کا ہونا چاہیئے۔ جس میں قرآن کے احکام، حدیث نبوی کی قولی و عملی تشریحات، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے اجتہادات اور آئمہ مجتہدین کے طرز استنباط اور جزئیات میں ان کی تصریحات کا مفصل تحقیقی مطالعہ کیا جائے۔ نیز دنیا کی دوسری پرانی اور نئی قوموں کے قوانین اور قانونی نظامات پر بھی گہری نظر رکھی جائے۔ اور زندگی کے روز بروز بدلنے والے معاملات و مسائل پر اصول قانونِ اسلامی کو منطبق کرکے فقہ کے ان چشموں کو پھر سے رواں کیا جائے۔ جو صدیوں سے سوکھ کر رہ گئے ہیں۔ یہ شعبے نہ صرف بجائے خود بہت عظیم الشان کام انجام دینگے بلکہ دوسرے تمام شعبوں کو بھی

کتاب اللہ و سنّت رسول اللہ کے متعلق انہی سے وہ مواد ملے گا جس کی بنیاد پر علم کی تمام راہوں میں تحقیق و اکتشاف کا کام چلایا جائے۔ ؎

اندکے گم شو بہ قرآن و خبر
باز اے ناداں بخویش اندر نگر!

امامت کی تکمیل

جس کھیت سے دہقان کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو !

امامت کی تعلیم کے عنوان کے تحت نئے نظامِ تعلیم کے چند شعبوں کا تمثیلاً ذکر کر دیا گیا ہے۔ جس سے پورے نقشے کی تفصیلات کا تصوّر بآسانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس نئے نظامِ تعلیم کی آخری اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں وہ بے مقصد تعلیم نہ ہو۔ جو آجکل ہندوستان میں دی جا رہی ہے۔ بلکہ اس میں تعلیم دینے والے اور تعلیم پانے والے دونوں کے سامنے ایک متعین اور واضح مقصدِ زندگی اور منتہائے سعی و عمل ہو۔ یعنی یہ کہ ان سب کو مسلکِ خدا پرستی کی امامت دنیا میں قائم کرنے کے لئے جہادِ کبیر کرنا ہے۔ یہ مقصد اس نظام کی ہر چیز میں اسی طرح کام کرے گا۔ جس طرح انسانی جسم کے ہر رگ اور ہر ریشے اور ہر حرکت میں اس کی روح کام کرتی ہے۔ طلباء کی شخصی زندگی، ان کے باہمی اجتماعات، ان کے کھیل کود اور تفریحات اور ان کے درس و

تدریس اور مطالعہ و تحقیق کے تمام مشاغل میں اسی مقصد کی کارفرمائی ہوگی۔ اس کے مطابق ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کی جائیگی۔ اس پر ان کے اخلاق ڈھالے جائیں گے۔ اور تمام ماحول ایسا بنایا جائے گا۔ کہ ہر شخص کو ایک مجاہد فی سبیل اللہ میں تبدیل کر دے۔ ؎

مجاہد کے لہو سے بڑھ کے عالم کی سیاہی ہے
کہ اس کا نکتہ نکتہ رشک گلزار ہوتا ہے!

اس قسم کی تربیت اور اس قسم کی تعلیم پاکر جو لوگ تیار ہوں گے۔ ان میں یہ طاقت ہوگی۔ کہ ان واقعات کی رفتار بدل دیں۔ ان کی محققانہ تنقید جاہلیت کے علوم اور جاہلیت کی تہذیب کی ساری بنیادوں کو ہلا دے گی۔ ان کے مدون کئے ہوئے علوم میں اتنا زور ہوگا۔ کہ جو لوگ آج جاہلیت کے نقطۂ نظر پر جمے ہوئے ہیں۔ ان کو وہ اسلامی نقطۂ نظر کی طرف پھیر لائینگے۔ ان کی تحقیق کے نتائج یورپ اور امریکہ اور روس تک کو متاثر کر دیں گے۔ اور ہر طرف سے معقول انسان ان کے نظریات کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ ان کا مرتب کیا ہوا نظریۂ حیات اور لائحہ زندگی اپنی قوت کے ساتھ فکر و نظر کی دنیا پر چھا جائے گا۔ کہ عمل کی دنیا میں اس کے خلاف کسی دوسرے لائحہ زندگی کا چلنا مشکل ہوگا۔ پھر اسی تعلیم سے اس سیرت اور اس عزم کے لوگ پیدا ہوں گے۔ جو امامت کے نظام میں عملاً انقلاب برپا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ وہ اس انقلاب کے فن کو بھی

جانتے ہونگے۔ ان میں اس کے برپا کرنے کا مضبوط داعیہ بھی ہوگا۔ اور انہیں اپنی انقلابی تحریک کو خالص اسلامی راہوں پر چلانا بھی آتا ہوگا۔ پھر انہیں میں یہ اہلیّت بھی ہوگی۔ کہ کامیابی کی منزل پر پہنچ کر اسلامی اصول کے مطابق ایک اسٹیٹ ایک مکمل نظام تمدّن کے ساتھ بنا کر کھڑا کریں جس کی شکل اور روح اسلامی ہو۔ اور جو دنیا میں امامت کرنے کی پوری طاقت و صلاحیت رکھتا ہو۔ ؎

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اسکو کیا سمجھیں، یہ بیچارے دو رکعت کے امام!

امامتِ صُغریٰ

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جسمیں ہے، ملت کی زندگی کا پیام

مساجد کی اہمیت

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ
ہوگیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم!

مساجد خانۂ خدا ہیں۔ بیت اللہ ہیں۔ عبادت گاہ ہیں۔ صرف اللہ کیلئے ہیں مسلمان پانچوں وقت ہیں انہیں میں نماز پڑھنے اور سر جھکانے پر مامور ہیں۔ گھر کی نماز سے، دوکان کی نماز سے اور صحرا کی نماز سے مساجد کی نماز باعث اجرِ عظیم ہے۔ مسجدوں کے ذریعے سے مسلمانوں کو زندہ کرنے کی تجویز عرصے سے مسلمانوں کے سامنے رہی ہے مسلمانوں کو یورپ اور برادرانِ وطن کی غلامی سے آزاد کرانے اور زندہ کرنے کا طریقہ یورپ کی تقلید اور قومیت کا جذبہ پیدا کرنا نہیں۔ بلکہ مسلمان آج اسی طرح زندہ ہو سکتا ہے جس طرح وہ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر گوشۂ گمنامی سے نکلا تھا۔ جس کا تمام دارو مدار مذہبی اصلاح پہ ہے۔ اور مذہبی اصلاح کا دارو مدار مسجدوں میں اچھے امام رکھنے پر ہے علماء کا وہ طبقہ جو ہر اصلاح کو الحاد سمجھتا ہے۔ امام بننے کے قابل نہیں۔ سے

مسجد میں چھپ کے بیٹھ گیا اپنا ہر امام
اور ہو گیا جہاد مسلمان پر حرام!

جو لوگ مسلمان قوم کو بیدار کرنے کے لئے مسجد کی اہمیت سے انکار کرتے ہیں وہ مسلمان قوم کو سرے سے سمجھتے ہی نہیں مسلمان سیاسی ہنگاموں اور لیڈروں کی سنسنی پیدا کرنے والی تقریروں سے زندہ نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں کو یہ کہنا کہ تم مذہب اور سیاست کو دو الگ الگ چیزیں سمجھو۔ اور مذہب کو شخصی مسئلہ جان کر اسے اپنے اور اپنے رب کے رشتے تک محدود رہنے دو۔ انہیں اپنی طرف بلاتا نہیں۔ بلکہ متنفر کرتا ہے۔ اسلام کے اثرات مسلمانوں کے رگ و ریشے میں سرائت کر چکے ہیں۔ اور ان کی قومی زندگی اسلامی روایات سے کچھ اس طرح پیوست ہو چکی ہے۔ کہ ان سے اسلامی روایات سے علیحدگی کا مطالبہ کرنا ان کے اپنے آپ سے انکار کرانے کے مترادف ہے۔ لہٰذا اگر تم مسلمانوں کو زندہ اور غلامی سے آزاد دیکھنا چاہتے ہو۔ تو ہر مسجد کو اپنا مرکز بناؤ۔ مسجدوں کے ذریعے ہر مسلمان تک اپنے خیالات پہنچاؤ۔ کیونکہ مسلمان کے دل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے مسجد سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں۔

آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر آقائے نامدار رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ مکہ کو اسلام کا پیغام دیتے ہیں۔ اور اس پیغام کو سُن کر جب ایک سعادتمند جماعت ان پر ایمان لے آتی ہے۔ تو آپ کے ایک فدائی کا گھر اس چھوٹی سی جماعت کا

مرکز بنتا ہے۔ جہاں یہ لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اور وہیں نماز پڑھتے ہیں۔ یہ اسلام کی پہلی مسجد تھی۔ مکہ کے تیرہ برس اسلام نے نہایت بے بسی میں گذارے۔ مدینہ پہنچتے ہی آپ نے پہلا کام یہ کیا۔ کہ مسجد کی بنیاد رکھی۔ یہ مسجد صحیح معنوں میں مدینہ کی زندگی کا سرچشمہ تھی۔ جہاں سے ہر مسلمان کی رگوں میں زندگی کا خون پہنچتا تھا۔ اور ہر مسلمان کی حاضری وقت مقررہ پر وہاں لازمی تھی۔ اس مبارک عہد میں مسلمانوں کی وہ مسجد محض سجدہ گاہ نہ تھی۔ بلکہ وہ حکومت کا مرکز، مشاورت کی جگہ، عدالت کا کمرہ اور تعلیم کے لئے مدرسہ تھا۔ جہاں قرآن وحدیث کے علاوہ فلسفہ، ریاضی اور دیگر تمام علوم متداولہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ؎

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشاد دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ !

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت راشدہ، دولت امویہ اور بنی عباس کے ابتدائی دور حکومت میں مسجد کی یہ اسلامی حیثیت برقرار رہی۔ خلیفہ کا فرض تھا۔ کہ دارالخلافہ میں جمعہ کی نماز خود پڑھائے۔ اور دوسرے شہروں میں اس کے نائب امام ہوں۔ حکومتوں کے فیصلے میدان جنگ میں نیزہ و تلوار سے طے پاتے تو قوم کے اس فیصلے کو منوانے کے لئے مسجد سے رضامندی حاصل کی جاتی تھی۔ مگر فی زمانہ مسلمانوں کی مسجدیں محض سجدہ گاہیں بن کر رہ گئی ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کا تقاضا کرتی ہے۔ کہ مسلمانوں کی مسجدیں محض عبادت گاہیں ہی نہیں۔ بلکہ

سیاست گاہیں بھی ہوں۔ ان کا مذہبی امام ہی ان کا سیاسی امام ہو۔ غرضیکہ مسلمانوں کی مذہبی، اجتماعی، تمدنی اور سیاسی الغرض تمام جماعتی سرگرمیوں کا مرکز مسجد ہو۔

لہذا اب مساجد کو کم نظر، زاویہ نشین، اور معاملاتِ دنیا سے بے خبر لوگوں کے ہاتھ میں رہنے دینا سب سے بڑی غلطی ہے۔ اور جب تک اس غلطی کی اصلاح نہ کی جائے گی۔ ہماری ترقی کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی۔ اس وقت مسلمانوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں۔ ایک زندگی اور ترقی کی راہ۔ دوسری تباہی اور بربادی کی راہ۔ اگر مسلمان زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اور آگے بڑھنے کی خواہش ہے۔ تو انہیں چاہیئے۔ کہ اپنی اصلاح کریں۔ اپنی جماعت کو اسلامی طریق پر منظم کریں۔ ان میں سچا اسلامی جذبہ پیدا کریں۔ ملت میں وحدتِ افکار کی تخلیق کریں۔ اور سب کی باگ ڈور ایک ہی قائدِ اعظم کے سپرد کریں۔ اور یہ سب چیزیں صرف اس وقت پوری ہو سکتی ہیں جبکہ مساجد کو اس اصلاحی تحریک کا مرکز بنایا جائے۔ ؎

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے، وہ الہام بھی الحاد!

امام کا عہدہ

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر، ایسے امام سے گذر!

امامت کا مستحق وہ شخص ہے۔ جو نماز کی حقیقت، ارکان و آداب، اور صحت و فساد کے تمام مسائل جانتا ہو۔ قرادت مسنونانہ سے اچھی طرح واقف ہو۔ قرآنِ کریم صحیح پڑھنا جانتا ہو۔ اگر قاری ہو تو بہتر ہے متقی اور پرہیزگار ہو۔ خوش اخلاق ہو۔ وجیہ اور خوبصورت ہو۔ شرافت نسبی رکھتا ہو۔ کمالاتِ ذوقی کا حامل ہو۔ اور سید ہو تو افضل ہے۔ علاوہ اس کے آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ کا پورا پورا مظہر ہو۔ کمالاتِ محمدیہ کا صحیح مترجم ہو۔ اسی حالِ محمدی کو سب سے پہلے اپنا حال بنائے اور پھر قول و فعل محمدی کی تبلیغ کو اپنا فرض قرار دے۔

مگر افسوس کہ آجکل مسلمانوں میں مسئلہ امامت کے متعلق بڑی بے احتیاطی اور جہالت برتی جاتی ہے۔ اور امامت و اقتداء دونوں کی مٹی پلید ہو رہی ہے ساری دنیا کے نکمے، عہدی، جاہل، اندھے، لنگڑے اور ناڑی مسجدوں میں بھرے

ہوئے ہیں۔ علم و فضل اور حسب و نسب کی تو پوچھ ہی کیا ہے۔ بتاؤ! جس قوم کے امام جاہل و کاہل ہوں۔ وہ دنیا میں کیا خاک ترقی کر سکتی ہے۔ جبھی تو مسجدوں میں وہ ہدائت و سعادت کا نور نہیں پھیلتا۔ جو زمانۂ سلف میں پھیلتا تھا۔ آہ! مسجدیں تو کسی قدر آباد ہیں۔ مگر ان میں ہدائت کا نور نہیں۔ کیونکہ ممبروں پر کندۂ ناتراش دھرے ہوئے ہیں۔

امامت کا معیار مسلمانوں کی ابتدائی زندگی میں بہت بلند تھا۔ اور جس قدر یہ زیادہ اہم تھا۔ اب اسی قدر غیر اہم ہو گیا ہے۔ جس منصب کے لئے بہتر سے بہتر آدمی منتخب کرنے کا حکم تھا۔ اب اس کے لئے بدتر سے بدتر آدمی چھانٹا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ذہن میں اب امام کا تصور یہ ہے۔ کہ جو شخص دنیا کے کسی اور کام کا نہ ہو۔ مسجد کا امام وہ بھی ہو سکتا ہے۔ دس پانچ روپے تنخواہ اور دونوں وقت کی روٹی مقرر کر دی اور کوئی نیم خواندہ امام رکھ لیا۔ امامت کو اس قدر پست کر دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری مسجدیں وہی مسجدیں جنہوں نے کبھی ہماری قوم کے قصر فلک بوس کی تعمیر کی تھی۔ آج ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ جو بے علم، تنگ نظر، پست حوصلہ اور دنی الاخلاق ہیں پس ایسے لوگوں سے مسلمانوں کی رہنمائی کی جو امید ہو سکتی ہے۔ وہ آپ جانتے ہیں۔ ؎

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اسکو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام!

دوسرے علماء کا طبقہ ہے۔ اور باستثناء چند اس طبقہ کے سوادِ اعظم کا جو
حال ہے اسے بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے
ان میں کا ہر شخص اپنے لئے ایک الگ مشرب رکھتا ہے۔ اور اپنے مشرب میں
اتنا سخت ہے۔ کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعائت کرنا اس کے
نزدیک گناہ کبیرہ سے کم نہیں۔ پھر اللہ نے ان کی زبان میں ایک ڈنگ رکھ دیا
ہے۔ جس سے دلوں کو زخمی کئے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا۔ نہ جس ماحول سے
تعلیم و تربیت پا کر آتا ہے۔ اور جس ماحول میں زندگی گذارتا ہے۔ وہاں دین کے
مہمات اور قوم کے مصالح کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اس کی تمام دلچسپیاں سمٹ
کر چند چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے لامحالہ وہ جب
زبان کھولے گا۔ انہی مسائل پر کھولے گا۔ اور نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اللہ کے گھر میں
گالی گلوچ اور جوتی پیزار ہوگی۔ اور ہر طرف سر پھٹول ہوگی۔

پس یہ تو مذہبی ذہنیت رکھنے والوں کا حال ہے۔ اب جدید تعلیم یافتہ
طبقہ پر نگاہ ڈالو۔ تو وہ ان مسائل سے پوری طرح دلچسپی نہیں رکھتے۔ ان پر
ایک اور مصیبت سوار ہے۔ کہ وہ اپنی تقاریر میں اکثر جھوٹی روائتیں اور
لاطائل کہانیاں اور احکام اسلام کی غلط تعبیریں کر جاتے ہیں۔ کہ
جن کو سنکر غیر مسلموں کا مسلمان ہونا تو درکنار، ذی ہوش مسلمانوں کا
مسلمان رہنا بھی دشوار ہے۔ پس امامت کی ذمہ داری وہی جماعت

اپنے سر لے سکتی ہے۔ اور امامت کا عہدہ اسی کے لئے سزاوار ہے۔ جو معتدل مزاج رکھتی ہو۔ اور ان کے پاس خطبات کا ایسا مجموعہ ہو۔ جو نزاعی مسائل سے پاک ہو۔ اور مسلمانوں میں صحیح دینی روح پھونکنے والے ہوں۔ ؎

غالب طلوع فکر پہ غفلت کی رات ہے
اس سے عجیب تر بھی کوئی اور بات ہے

امام کی ذمّہ داری

سو بار کی کہی ہوئی باتوں کو کیا کہیں ؟
کس بات کو عجیب کہیں یا نبیا کہیں !

امام ہمیشہ اپنے رسولؐ کا جانشین ہوتا ہے۔ اس لیئے امامت کے فرائض میں مسلمانوں کے اُن تمام شعبہ ہائے زندگی کا انتظام و انصرام داخل ہے۔ جن کی باگ ڈور خود رسول اللہ کے ہاتھ میں تھی۔ اور منجملہ ان تمام فرائض کے امام کا سب سے بڑا فرض اقامتِ دین ہے۔ اور مذہب، اخلاق سیاست وغیرہ تمام چیزیں امامت کے دائرۂ اقتدار میں داخل ہیں۔ علاوہ ازیں اسلام کی اشاعت تبلیغ، قرآنی اوامر و احکام کا اجراء و نفاذ، مساجد کی آبادی و نگرانی، اسلامی عقائد و ارکان کی تشریح، اسلامی اصولوں کی فلاسفی، قومی تنزل کے اسباب اور ان کا علاج، قوم کی ترقی کے وسائل اور ان کا حصول اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرنا سب امور امامت کے فرائض میں داخل ہیں۔

اسلام نے امامت پر اس لیئے زور دیا ہے۔ کہ اسلام میں اخوّت اور مساوات

پیدا ہو۔ مسلمانوں کو ایک خیال اور ایک ذہنیت پر لانے کی تحریک کی جائے۔ تمام مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہو۔ مرکزیت اسلام پیدا ہو۔ مسلمانوں کے اجتماعی کام سر انجام ہوں۔ ان کی دینی و دنیوی ضروریات کما حقہٗ پوری ہوں۔ ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں، اور بیرونِ دریا کچھ نہیں!

امام تمام مقتدیوں کے قلوب کا مالک ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا ہے۔ "اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً، اِذَا صَلَحَتْ، صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَ اِذَا فَسَدَتْ، فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ"

یعنی دل انسان کے جسم میں ایک ایسا عضو ہے۔ کہ جب وہ درست ہو تو تمام جسم درست رہتا ہے۔ اور اگر اس میں کوئی خرابی آجائے۔ تو تمام جسم کے خلل کا موجب ہوتی ہے۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

کعبہ بنیادِ خلیلِ آذر است | دل گذرگاہِ جلیلِ اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است | دل بدست آور کہ حج اکبر است

نماز با جماعت میں بس یہی بات ہوتی ہے۔ کہ تمام مقتدیوں کے قلوب امام کے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ اور مقتدیوں کے قلوب میں امام کی ذہنیت ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا زبردست رابطہ ہے۔ کہ اس کی بدولت بہت کچھ اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اسی لئے جماعت کے ساتھ نماز گزارنے کا حکم نہایت تاکید

کے ساتھ دیا گیا ہے۔ تنہا انسان کوئی اہم تدبیر نہیں کرسکتا۔ لیکن ایک جماعت کی تدبیر سے کسی معاملہ کا کوئی پہلو فروگذاشت نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جماعت کی سخت ضرورت ہے۔ اور اسی سے قومیّت کی بنیاد مستحکم ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کی امامت و قیادت کسی ماہر فن امام کے ہاتھ میں ہو۔ جو قوم کے تعمیری کام کی پوری پوری اہلیّت رکھتا ہو۔ اور قوم کی اندرونی امراض کی تشخیص کرکے ان کے تدارک کے لئے بہترین نسخہ تجویز کرسکتا ہو۔ اور افرادِ قوم میں عملی روح پھونک کر اقدام عمل کی طرف ان کی رہنمائی کرسکتا ہو۔

سو اس کے لئے سب سے پہلے اپنی عقل کو زنگِ خرافات سے پاک کرو۔ ہر دینی عقائد کو دلائل و براہین سے محکم کرکے یقین کا درجہ حاصل کرو۔ مذہبی امور میں ظن و گمان کی بجائے دلیل و عقل کو دستاویز بناؤ۔ شک کی جگہ یقین اور اضطراب کی جگہ امن و سکون پیدا کرو۔ عقل کی رہنمائی اور ناخنِ تدبیر سے اپنی مشکلات کو عبور کرو۔ نظر و استدلال کی اہلیّت پیدا کرو۔ اور نورِ عقل کو نورِ نبوّت کے ماتحت رکھو۔ اوّل دین کی بدیہات پیش کرو۔ جوں جوں استعداد و قابلیّت بڑھتی جائے۔ نظریات کی طرف توجہ کرو۔ عقل و فہم کی صحیح نشوونما اور تربیت کا صحیح طریق سیکھو۔ اسلام نے ساری بنیاد ہی علم و یقین پر رکھی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کا پہلا سبق

یہ ہے: "ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" یعنی یہ کتاب ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اگر اس سے استفادہ کرنا چاہتے ہو۔ تو اپنے اندر یقینی کیفیت پیدا کرو۔ کیونکہ اسلام شک کی جگہ یقین، ظلمت کی جگہ نور، ظن کی جگہ علم و بصیرت اور قیاس و گمان کی جگہ حجت و برہان کی تعلیم لے کر آیا ہے۔ ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں!

امام کی صفات

تو غازی ملت ہے، ورس بقا دے
مسلماں کو مر مر کے جینا سکھا دے!

امام کے اعمال و افعال کے تمام لوگ نگران ہوتے ہیں۔ اگر امام کے اعمال ان کیلیے نمونہ نہ ہونگے تو وہ اسے امامت کے عہدہ سے علیحدہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ انفرادی حیثیت سے ہر مسلمان مبلغ و مجاہد ہے۔ لہذا امام کیلیئے ضروری ہے کہ وہ شارعؑ کے ہر کلمہ کی صحیح غرض و غایت پہچانتا ہو۔ جو شخص یہ نہیں جانتا۔ کہ کسی کام کا حکم دینے اور فعل سے منع کرنے میں شارع کے پیش نظر کونسا مقصد اور کونسی مصلحت ہے۔ اور جو شخص یہ نہیں سمجھتا۔ کہ کسی حکم کی بجا آوری کے لیئے شارع نے جو عملی صورت مقرر کی ہے اس خاص صورت میں کیا حکمت مدِّ نظر ہے۔ اور اصل مقصد کے حصول کیلیئے کون کون چیز کس کس طرح مددگار ہے۔ اس کیلیئے زندگی کے مختلف احوال میں شریعت کا صحیح اتباع کرنا یا کرانا نہ صرف مشکل بلکہ محال ہوگا۔ اسکے پاس شریعت کا صرف جسم ہوگا روح نہ ہوگی۔ وہ محض استخوان کا مالک ہوگا۔ مغز نہ پا سکے گا۔ اسکی نگاہ احکام کی

محض عملی صورتوں پر ہوگی۔ مگر ان احکام میں جو مصالح و مقاصد پوشیدہ ہیں۔ وہ اسکی نظروں سے اوجھل ہونگے۔ وہ بظاہر تو شارع کے احکام کی پیروی کریگا۔ مگر دراصل انکے مقاصد سے محروم رہیگا۔ اور اپنے عمل سے نہ خود پوری طرح مستفید ہو سکے گا۔ اور نہ دوسرے کو فائدہ پہنچا سکے گا۔

علم حق غیر از شریعت ، ہیچ نیست
اصل سنت جز محبت ، ہیچ نیست !

پس امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ اصول اسلام اور احکام شریعت کی تہ تک پہنچے۔ ہر حکم کی صحیح غرض و غائت معلوم کرے۔ اور اپنے ہر قول و فعل کو اس غرض و غائت کی تکمیل کیلئے صرف کرے۔ اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے سادہ اعتقاد کے سوا اور کوئی مطلب پیش نظر نہ رکھے۔ اپنے تمام فرائض کو مردانہ وار اور بے غرضانہ بجالائے۔ اس کا تمام لائحہ عمل تبلیغی ہو۔ محض اسلام کے بوسیدہ کھنڈرات پر ماتم کرنے والا نہ ہو بلکہ خوابیدہ غفلت مسلمانوں کو قرآن کریم و شریعت اسلام کی روشنی میں پیغام دے۔ کہ اٹھو! آباؤ اجداد کی تاریخ دھرانے کا وقت آگیا ہے۔ اب جاہ و جلال تم پر نثار ہوگا۔ اور تم پچھلی شان و شوکت کے مالک بن جاؤ گے۔

اس کا تمام علم و عمل وہمی باتوں سے بالاتر ہو۔ اور یقینیات سے لبریز ہو۔ لفظی و معنی آیات الہٰی کو سامنے رکھ کر آگے بڑھانا اس کی تعلیم کا سب سے بڑا جوہر ہو۔ خود غرضی، نفسانیت اور بے اصولی سے اجتناب کرے۔ الزامی جواب،

نفرت، بغاوت، سب و شتم، اور مغالطہ سے حتی الوسع پرہیز کرے۔ ان سے کبھی دیرپا اور مفید نتائج پیدا نہیں ہوتے۔ مخلوقاتِ الٰہی کیلئے رحمت اور برکت کا نمائندہ ہو۔ کیونکہ اسلام فصل (تفریق) کیلئے نہیں۔ بلکہ رحمت، جذب اور وصل کیلئے آیا ہے۔

اسلام دنیا میں ہر فردِ بشر کی عزت بحال کرنے آیا ہے۔ اور وہ ملکی، قومی اور شخصی اغراض و مفاد سے بالاتر ہے۔ لہٰذا شخصیت پرستی، زر پرستی اور ان کے ظلم کو پاش پاش کرنا اپنا فرضِ عین تصوّر کرے۔ اس کی زندگی میں سوائے اللہ تعالیٰ کے اعتقاداً و عملاً نفیِ اقتدار، تمام غیر فطرتی غلامیوں سے نجات اور اسلامی بادشاہت کی تیاری و غلبۂ خلافتِ ربّانی ہو۔ فرض شناسی، خودداری، تعلیم و تربیت، بے داغ چلن، گرم جوشی اور نظام وغیرہ امور ہر وقت اس کے محرک ہوں۔ سہ

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سِرّ آدم ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی!

امام کی اطاعت

کسبِ ہنر کیا بھی تو قدرِ ہنر کہاں
ملتا ہے کوئی تشنۂ آبِ گوہر کہاں!

آج سے کچھ عرصہ پیشتر آئمہ مساجد کی بڑی شخصیت ہوتی تھی۔ بچہ بچہ ان کی عزت کرتا تھا۔ ہر شخص ان سے ڈرتا تھا۔ تمام قوم پر ان کا رعب تھا۔ آج امامت کو کوئی کچھ سمجھے۔ اور اماموں کا اثر کتنا ہی زائل ہو چکا ہو۔ پھر بھی امامت مسندِ رسول ﷺ ہے۔ اور وہ جلیل القدر منصب ہے۔ جس پر رسول کریم ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر اولیاء و اکابر صدیوں فائز رہے ہیں۔ اسی عہدِ سعادت میں آج کی طرح مسجدیں "شکوہ گذار نمازی" نہ تھیں۔ بلکہ ہر مسجد پانچوں وقت نمازیوں سے بھری رہتی تھی۔ جہاں ہر درجے وہر رتبے کے لوگ آتے اور ایک امام کے اقتدار میں کھڑے ہو کر خدائے وحدہٗ لاشریک کی بارگاہ میں اپنی جبینِ نیاز گراتے تھے۔ اس کے ایک اشارۂ اللہ اکبر پر رکوع و سجود کرنا سب کیلئے فرض تھا۔ پھر کیونکر ممکن تھا۔ کہ اس کی عزت تو عزت اطاعت نہ کی

جاتی۔ بہترین امت کا امام بھی بہترین ہی ہو سکتا تھا۔ اور ہوتا تھا۔ اور وہ ہوتا تھا جو نہ صرف علم و فضل، اخلاق و عادات اور عمل وغیرہ میں امتیازی حیثیت رکھتا ہو بلکہ صلاح و تقوی میں بھی برگزیدہ شان رکھتا ہو۔ نیز یہ کہ تمام مسلمانوں نے اسے اپنی امامت کے لئے منتخب کیا ہو۔ اور سب اس سے خوش ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔" ثلثة لا یقبل اللہ صلوٰتھم من تقدم قوماً وھملہ کارھون " تین وہ شخص ہیں جن کی نماز اللہ قبول نہیں کرتا۔ جن میں ایک وہ ہے۔ جو اپنی قوم کا امام ہو۔ اور لوگ اس سے ناراض ہوں۔ اس سے واضح ہوتا ہے۔ کہ امامت کتنا بڑا منصب ہے۔ اسے کتنی بڑی فضیلت ہے اور اس کیلئے دو امور ضروری اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ اولاً یہ کہ وہ علم و عمل کے اعتبار سے ممتاز ہو اور ثانیاً اتنا با اخلاق اور شریف ہو کہ تمام نمازی اس سے خوش رہ سکیں ے

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں ؟
فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق !

اور ان ہر دو صفات کی عدم موجودگی میں سب سے بڑا عذاب اس پہ یہ پڑیگا۔ کہ اسکی نماز قبول نہ ہوگی۔ اور اسکی تمام عبادت ضائع جائیگی۔ کوئی متقی مسلمان تو یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ محض منصب امامت کی حرص میں وہ اپنی عبادت کے ثواب کو ضائع کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اور اخروی عذاب خریدلے۔

جس طرح نماز ہمیں روحانی علوم کے ہزاروں سبق دیتی تھی۔ اور وقت کی پابندی، ظاہر و باطن کی صفائی، اتفاق و اتحاد، یک جہتی و یکرنگی، ہمدردی و محبت، ایک ساتھ جینا اور ایک ساتھ مرنا سکھاتی تھی۔ اسی طرح امامت ہمیں اطاعت الٰہیہ کا درس دیتی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ جو قوم اپنے امیر کی جتنی مطیع ہوگی۔ اُتنا ہی اُسے علو و اقتدار حاصل ہوگا۔ اتنا ہی اسے اپنی ارتقائی منازل کاٹتے کرنا آسان ہو جائیگا۔ اور وہ اپنے ہر مقصد میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی جائیگی۔

مگر اس زمانے میں ہمارے اکثر اماموں کا یہ حال ہے۔ کہ مقتدی خوش ہوں یا ناراض۔ نماز اللہ تعالیٰ قبول کرے یا نہ کرے۔ لیکن وہ منصب امامت چھوڑنے پر ہرگز آمادہ نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے جائز و ناجائز طریق پر اپنے قبضہ میں رکھنے کے لئے ہر قسم کی سازشیں اور جھوٹ و فریب تک کو روا رکھتے ہیں۔ کچھ تو مسلمانوں نے انتخاب کی طرف سے بے پرواہی اختیار کرلی۔ اور کچھ اماموں نے امامت کو ذاتی جاگیر و ریاست بنالیا ہے اگر کوئی مسلمان مقتدیوں کی ناخوشی و نارضامندی کی بناء پر کسی امام کے خلاف آواز بھی بلند کرتا ہے۔ تو یہ لوگ لڑنے اور مرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔

یہی حالت متولیانِ مساجد کی ہے۔ کہ وہ بھی اپنی جگہ خود مختار بنے ہوئے ہیں۔ غرض یہ ہے۔ کہ ہماری اس اہم ترین عبادت کی پوری پوری مشینری مسلمانوں کے ہاتھوں درہم برہم ہو کر رہ گئی ہے۔ نہ نمازی ٹھیک رہے نہ نماز، نہ اماموں میں وہ فضیلت باقی رہی اور نہ متولیوں میں غیرت ملی کا اثر رہا۔

رائے عامہ میں نمازیوں کا وقار کم ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان مساجد سے ایک گونہ بے تعلق ہو رہے ہیں۔ قوم کی مرکزیت فنا ہو رہی ہے۔ جمعیت کمزور ہو رہی ہے۔ اور اس کی اصلاح کے لئے کوئی تعمیری پروگرام تاحال تیار نہیں ہوا۔ ؎

بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی، تو ڈوبیں گے سارے!

امام کی جماعت

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی !

کسی جماعت کی کامیابی کا دارومدار ہمیشہ ضبط (Discipline) پر ہوتا ہے۔ اور حصولِ ضبط کے لئے باقاعدگی درکار ہے۔ لہٰذا نماز باجماعت میں صفوں کا لحاظ رکھنا بڑا ضروری ہے۔ نماز شروع کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیئے۔ کہ تمام صفیں سیدھی ہیں یا نہیں۔ صفیں بناتے وقت اوّل پہلی صف کو پورا کرنا چاہیئے اگر آدمی کم ہوں اور صف پوری نہ ہو سکتی ہو۔ تو پھر پیچھے کھڑے ہونے والوں کو اس طرح کھڑا ہونا چاہیئے۔ کہ آدھے آدھے آدمی امام کے دونوں طرف آ جائیں اگر پہلی صف پوری ہو جائے تو اسکے پیچھے دوسری صف باندھ لینی چاہیئے۔ اور اس میں بھی اگر آدمی کم ہوں۔ تو پھر اس صف کو بھی پہلی صف کے پیچھے درمیان میں کھڑا ہونا چاہیئے۔ اکیلا آدمی ایک صف کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے لئے کسی صف میں گنجائش نہ ہو۔ تو اسے چاہیئے۔ کہ کچھ عرصہ انتظار کرے۔ اگر کوئی اور شامل ہونے والا نہ ہو

تو آخری صف میں آہستگی کے ساتھ ایک سمجھ دار آدمی کو پیچھے ہٹالے اور اپنے ساتھ کھڑا کر لے تاکہ ایک صف بن جائے۔

ترتیب صفوف میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ سب سے اوّل مردوں کی صفیں ہوں۔ پھر لڑکوں کی۔ اسکے بعد عورتوں کی اور سب کے بعد لڑکیوں کی صفیں ہوں۔ بڑے آدمیوں کی صف میں لڑکوں کا کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ اسی طرح عورتوں کی صف بچوں کے بعد ہونی چاہیئے۔ عورت اگر اکیلی ہو۔ تو وہ اکیلی ہی سب کے پیچھے کھڑی ہوسکتی ہے۔ امام کے نزدیک ہمیشہ ایسے آدمیوں کو کھڑا ہونا چاہیئے جو دین میں زیادہ سمجھ رکھتے ہوں۔ علاوہ اسکے صف بندی میں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ کندھے سے کندھا ملا رہے اور درمیان میں فاصلہ نہ رہے۔

نماز باجماعت صرف دو آدمی بھی پڑھ سکتے ہیں جن میں سے ایک امام بن جائے اور دوسرا مقتدی لیکن اس صورت میں مقتدی امام کے پیچھے نہیں کھڑا ہوتا۔ بلکہ امام کے دائیں ہاتھ ساتھ ہی کھڑا ہوتا ہے۔ اور اسکے پاؤں کی اُنگلیاں امام کی ایڑی کے مقابل ہوتی ہیں۔ بائیں طرف مقتدی کا کھڑا ہونا مکروہ تنزیہی ہے۔ اگر دو آدمی اس طرح نماز پڑھ رہے ہوں اور تیسرا آدمی بھی نماز باجماعت میں شریک ہونا چاہے تو تیسرے آدمی کو چاہیئے۔ کہ پہلے مقتدی کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر آہستہ سے پیچھے ہٹالے۔ اور اس کے ساتھ کھڑا ہو جائے یا امام کو اتنا آگے ہو جانا چاہیئے کہ مقتدیوں کو سجدہ کرنے کے لئے جگہ مل جائے۔ اور اس کے پیچھے دو آدمیوں کی

صف بن جائے۔ اس طرح مقتدیوں کے پیچھے ہٹتے یا امام کے آگے بڑھنے سے نماز نہیں ٹوٹتی۔ اور پانچ فرض نمازوں میں امام کے سوا کم از کم ایک آدمی اور جمعہ کی نماز میں تین آدمی ہونے ضروری ہیں۔ جماعت کی نماز میں مقتدی کو صرف پہلی رکعت میں ثنا پڑھ کر باقی رکعتوں میں چپ رہنا چاہیئے۔ اور اس کیلئے تعوذ، تسمیہ، سورۂ فاتحہ اور اس کے بعد کسی دوسری سورت کے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اور جس وقت رکوع کے بعد کھڑے ہوں تو امام صرف تسمیع اور مقتدی صرف تحمید پڑھیں۔ مگر اکیلے نماز پڑھنے کی صورت میں تسمیع اور تحمید دونوں پڑھنے چاہئیں۔ اسی طرح سلام کرتے وقت جس طرف امام ہو اس طرف کے سلام میں نمازی اور فرشتوں کے ساتھ امام کی بھی نیت کرنی چاہیئے۔ اور امام دونوں طرف کے سلام میں مقتدیوں کی نیت کرے اور مقتدی کو امام سے پہلے سجدہ اور رکوع میں چلے جانا اور سر اٹھانا مکروہ تحریمی ہے۔

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

امام کی شرائط

سے میری بانگ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ
کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود!

امام کے پیچھے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا سنّت مؤکدہ ہے۔ جو شخص بغیر علم کے امامت کراتا ہے اسکی مثال ایسی ہے۔ جیسے کوئی سمندر کے پانی کو ناپتا ہے۔ مگر اسکی کمی بیشی کو نہیں سمجھتا۔ مسجد کا مقررّہ امام کسی اجنبی شخص سے امامت کا زیادہ مستحق ہے اگرچہ اجنبی شخص اس سے افضل ہو۔ دیوانے، نشّے والے، کافر اور مشرک کے پیچھے نماز بالکل نہیں ہوتی۔ اور نابالغ کے پیچھے بالغوں کی اور عورت کے پیچھے مردوں کی نماز نہیں ہوتی۔ مگر مردوں کے پیچھے عورت کی نماز ہو سکتی ہے۔ اور جس نے باقاعدہ وضو اور غسل کیا ہے اسکی نماز معذور کے پیچھے نہیں ہوتی۔ اسی طرح جو خود رکوع و سجدہ کرتا ہے۔ اسکی نماز اشاروں سے رکوع و سجدہ کرنے والے کے پیچھے نہیں ہوتی مگر بدعتی، فاسق، جاہل گنوار، جاہل غلام، اندھے اور ولدالزّنا کے پیچھے نماز ہو تو سکتی ہے مگر مکروہ ہوتی ہے۔ اور فاسق جو اعلانیہ گناہ کرے۔ اس کے پیچھے

مکروہ تحریمی اور باقیوں کے پیچھے مکروہ تنزیہی ہے۔ اور اگر ان سے افضل کوئی اور شخص نہ ملے۔ تو بلا کراہت اس کی امامت جائز ہے۔ اسی طرح اگر کوئی لڑکا پندرہ سال کا ہو جائے۔ اگرچہ اور کوئی علامت بلوغ کی ظاہر نہ ہو۔ تو اس کے پیچھے بھی نماز جائز ہے۔ مگر اس سے کم عمر کے لڑکے کے پیچھے نماز درست نہیں کیونکہ نابالغ کے ذمہ کوئی نماز فرض نہیں ہوتی۔ اسے صرف عادت ڈالنے کے لئے نماز کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس کی نماز ایک قسم کی نفلی نماز ہوتی ہے۔ اور نفل پڑھنے والا فرض پڑھنے والوں کا امام نہیں ہو سکتا۔

امام کو چاہیئے۔ کہ اپنے مقتدیوں کا خیال رکھے۔ اگر مقتدیوں میں کمزور اور بیمار آدمی بھی ہوں تو ان کی رعائت سے قرات کو مختصر کرے۔ امام اگر قراءت بھول جائے یا غلطی کرے تو مقتدیوں کو اس کی اصلاح کر دینی چاہیئے۔ قرات کی غلطی تو صحیح الفاظ کے پڑھنے سے درست ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر رکعت کے رکوع و سجود اور قیام میں امام سے کوئی غلطی ہو جائے تو مقتدیوں کو "سبحان اللہ" کہہ کر اسے متنبہ کر دینا چاہیئے۔ فجر، مغرب اور عشا کی نماز میں قرأت جہری پڑھی جاتی ہے۔ اور ظہر و عصر میں قرات خفی ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ اور مغرب و عشاء کی صرف پہلی ہی دو رکعتوں میں قرات جہری ہے۔ اور باقی ایک یا دو رکعتیں قرات خفی سے ادا کی جاتی ہیں۔ نماز با جماعت میں مقتدی اور امام کی نماز جن شرائط سے وابستہ ہوتی ہے۔ وہ یہ ہیں۔ کہ مقتدی اقتدا کی نیت

کرے۔ امام اور مقتدی کی جگہ ایک ہو۔ اگر امام اور مقتدی جداگانہ مکانوں
میں ہوں۔ تو امامت درست نہیں ہوتی۔ اسی طرح امام اور مقتدی کی نماز
ایک ہو۔ اگر امام فرض پڑھتا ہو اور مقتدی نفل یا اس کے برعکس تو امامت
صحیح نہیں۔ مقتدی کے خیال میں امام کی نماز صحیح ہو۔ اگر مقتدی کی دانست
میں امام کی نماز صحیح نہیں۔ تو امام کی امامت اور مقتدی کی اقتداء درست
نہ ہوگی۔ مقتدی امام سے آگے نہ بڑھے۔ اور وہ امام کے ایک رکن سے دوسرے
رکن میں جانے کو جانتا ہو۔ مقتدی تمام ارکان میں امام کی اقتداء کرے۔ اگر
کسی ایک رکن میں بھی اقتداء نہ کی۔ تو مقتدی کی نماز درست نہ ہوگی۔ نماز کے
ارکان کی بجا آوری میں مقتدی امام کی مانند ہو۔ مثلاً اگر امام اشارے سے
نماز پڑھے تو مقتدی بھی اشارے سے پڑھیں۔ مقتدی امام کی حالت سے
واقف ہو کہ وہ مسافر ہے یا مقیم۔

پانچ چیزیں ایسی ہیں۔ کہ اگر امام چھوڑ دے تو مقتدی بھی چھوڑ دیں۔ اور
امام کی پیروی کریں۔ مثلاً عیدین کی تکبیریں، قعدۂ اولیٰ، سجدۂ سہو، سجدۂ
تلاوت اور قنوت۔ اور بعض چیزیں ایسی ہیں۔ کہ اگر امام کرے۔ تو مقتدی اس
کی پیروی نہ کریں۔ مثلاً عیدین کی تکبیروں میں زیادتی کرنا۔ جنازے کی نماز میں
چار سے زیادہ تکبیریں کہنا۔ کسی رکن کو زیادہ کرنا۔ مثلاً دو دفعہ رکوع کرنا۔
پانچویں رکعت کے لئے امام کا کھڑا ہونا۔ اور بعض چیزیں ایسی ہیں۔ کہ اگر امام

انہیں ترک کر دے۔ تو مقتدی ضرور ادا کریں۔ مثلاً تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اُٹھانا۔ ثناء پڑھنا۔ تکبیراتِ انتقالی یعنی رکوع و سجود وغیرہ کے وقت تکبیر کہنا۔ تسبیحات رکوع و سجود، تسمیع کہنا تشہد پڑھنا۔ لفظ السّلام پڑھنا اور تکبیراتِ تشریق کہنا۔ علاوہ ان کے نماز میں قراءت و اذکارِ مسنون سے زیادہ طول دینا۔ اجنبی عورتوں کی ایسی جگہ امامت کرنا۔ جہاں امام کی محرم عورتیں نہ ہوں۔ اور دو مقتدیوں سے زیادہ کی صف میں امام کا بیچ میں کھڑا ہونا مکروہ تحریمی ہے، اور دو مقتدیوں کی صف کے بیچ میں کھڑا ہونا مکروہ تنزیہی ہے ؎

ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی!
نصیحت بھی تیری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی

امام کے مقتدی

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بُتِ پندار کو اپنا خدا تو نے!

مقتدیوں کی چار قسمیں ہیں۔ مُدرِک، مَسبُوق، لاحق اور مسبُوق لاحق۔ مُدرِک وہ ہے۔ جس نے شروع سے آخر تک پوری نماز امام کے ساتھ ادا کی ہو۔ یعنی پہلی رکعت میں شامل ہُوا ہو اور آخر تک ساتھ رہا ہو۔ اسے پہلی رکعت میں صرف ثناء پڑھ کر خاموش رہنا چاہیئے۔ اور تعوذ، تسمیہ، سورۂ فاتحہ اور اس کے بعد کسی دوسری سورت کے پڑھنے کی اسے ضرورت نہیں۔ اور اس کے بعد رکوع، سجود اور قعدہ وغیرہ میں حسبِ دستور امام کی اقتداء میں سب اذکار پڑھنے چاہئیں۔ اور قومہ میں صرف تحمید ہی کہنی چاہیئے۔ تسمیع کی ضرورت نہیں۔ اور سلام پھیرتے وقت جس طرف امام ہو۔ اس کی بھی نیت کرنی چاہیئے۔

مسبوق وہ ہے جس کی اقتدا سے پیشتر امام سب یا بعض رکعتیں پڑھ

چکا ہو۔ یا جیسے امام کے ساتھ شروع سے ایک یا کئی رکعتیں نہ ملی ہوں۔ اسی طرح اگر کوئی نمازی بعد میں شامل ہو۔ تو اسے تکبیر کہہ کر اسی حالت میں نماز شروع کر دینی چاہیئے۔ جس حالت میں کہ امام اور دوسرے مقتدی ہیں۔ اگر وہ سجدے میں ہیں تو سجدے میں جانا چاہیئے۔ اگر قعدے میں ہوں تو قعدہ میں بیٹھ جانا چاہیئے۔ اور اگر حالت رکوع میں ہیں تو رکوع میں، اور اگر قیام میں ہیں تو قیام میں۔ قرات یا رکوع میں شامل ہونے سے رکعت ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد شامل ہو۔ تو پھر جس قدر رکعتیں رہ گئی ہوں۔ اُسی قدر امام کے سلام پھیرنے کے بعد پوری کرے۔

غرضیکہ مسبوق بقیہ نماز کو اسی طرح پوری کرے۔ جس طرح کہ فوت ہوئی ہے یعنی امام کے ساتھ آخر نماز تک شریک رہے۔ جب امام سلام پھیرے تو مسبوق اس کے ساتھ سلام نہ پھیرے۔ بلکہ کھڑا ہو جائے اور چھوٹی ہوئی رکعتوں کو اس طرح ادا کرے۔ گویا اس نے ابھی نماز شروع کی ہے۔ مثلاً اگر پہلی رکعت چھوٹی ہو۔ تو کھڑے ہو کر ثناء۔ تعوذ۔ تسمیہ، سورۂ فاتحہ اور اس کے بعد دوسری سورت پڑھ کر حسب قاعدہ رکوع و سجود کرے۔ اور از سر نو قعدہ کے بعد سلام پھیرے اگر ظہر، عصر، عشاء یا فجر کی دو رکعتیں رہ گئی ہوں۔ تو دوسری رکعت اسی طرح سورۂ فاتحہ اور اس کے بعد دوسری سورت پڑھ کر پوری کرے اور قعدہ کے بعد سلام پھیرے۔ اگر تین رکعتیں رہ گئی ہوں۔ تو دو رکعتیں فاتحہ و سورت سے اور

تیسری صرف فاتحہ پڑھ کر پوری کرے۔ اور مغرب کی نماز میں اگر ایک ہی رکعت ملی ہو تو باقی ہر دو رکعتوں کے بعد حسبِ دستور قعدہ کرے۔

لاحق وہ ہے۔ جس کی کل یا بعض رکعات۔ بعد اقتدا اور تحریمہ کے کسی عذر سے فوت ہو گئی ہوں۔ یعنے امام کے ساتھ شریک ہونے کے بعد کسی عذر کی وجہ سے ایک یا کئی رکعتیں جاتی رہی ہوں۔ جیسے ایک شخص امام کے ساتھ شریک ہؤا۔ لیکن قعدے میں بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ اور اتنی دیر سویا رہا۔ کہ امام نے ایک یا دو رکعتیں اور پڑھ لیں۔ سو لاحق کی جو رکعت کسی عذر مثلاً سو جانے یا وضو ٹوٹ جانے سے رہ گئی ہوں۔ تو جس وقت وہ جاگے یا وضو کر کے واپس آئے۔ تو پہلے اپنی چھوٹی ہوئی نماز امام کا ساتھ چھوڑ کر پڑھ لے۔ اور اس طرح پڑھے جیسے امام کے ساتھ پڑھتا ہے۔ یعنی قرأت نہ کرے۔ اور جب اسی ترتیب سے چھوٹی ہوئی نماز پوری کر لے۔ تو امام کے ساتھ ہو کر باقی نماز پوری کرے اور اگر امام فارغ ہو چکا ہو۔ تو اسی طرح باقی نماز پوری کرے۔ جیسے امام کے پیچھے پڑھتا ہے۔ اور اس حالت میں اگر اس سے کوئی سہو ہو جائے۔ تو سجدہ بھی نہ کرے۔ کیونکہ اس وقت بھی وہ مقتدی ہے۔ اور مقتدی کے سہو پر سجدہ سہو لازم نہیں آتا۔

مسبوق لاحق وہ ہے کہ دوسری رکعت میں بحالتِ قیام امام کے ساتھ شریک ہو۔ پھر تیسری یا چوتھی رکعت میں سو گیا یا وضو ٹوٹ گیا۔ اور امام کے

کچھ ارکان ادا کرنے یا پوری نماز ادا کرنے کے بعد بیدار ہُوا یا وضو سے فارغ ہُوا۔ اسے چاہیئے۔ کہ پہلے اپنی ان رکعات کو جو امام کی اقتداء کے بعد فوت ہوئیں۔ لاحق کی طرح بلا قرات پڑھے۔ اور پھر اسی رکعت کو جو اقتداء سے پہلے فوت ہوئی ہے۔ مسبوق کی طرح معہ قرات ادا کرے۔ ؎

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں!

امام کا خطبہ

دِل مُردہ دِل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے، اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ!

خطبہ بھی نماز کی طرح ایک عبادت ہے۔ جسے موعظتہ الامام بھی کہتے ہیں، لیکن دونوں کے مقاصد مختلف ہیں۔ نماز، حمد و ثنا، تسبیح و تہلیل اور دعا و سجود ہے جس کا مقصد یادِ الٰہی، ذاتِ حق کی طرف رجوع اور خشیّت و انابت وغیرہ ہے۔ اور خطبہ وعظ و ارشاد اور اصلاح و ترقی ملّت کے ایک پروگرام کی حیثیت رکھتا ہے جس کا مقصد عامتہ النّاس کو ان کی ملّی و سیاسی ضروریات سے آگاہ و خبردار کرنا ہے۔ تاکہ مسلمان اجتماعی، سیاسی، تعلیمی، تمدّنی، ملکی اور معاشرتی اعتبار سے ترقی کرتے رہیں۔ امام بمنزلہ ایک مقرّر کے ہوتا ہے۔ اور نمازی بمنزلہ حاضرین جلسہ کے۔ اور خطبہ صدرِ جلسہ کی ایک تقریر ہے۔ قائدِ ملّت کا ایک لیکچر ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ رسول اکرمؐ اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے مختلف اوقات میں مختلف خطبے دئے ہیں۔ اور ہر

ایک خطبہ زمانے کی رفتار اور ضروریاتِ وقت کو پیشِ نظر رکھ کر دیا ہے
جس سے مسلمانوں کے ایمان تازہ، نظر وسیع، حوصلے بلند، عزم راسخ،
اور ہمتیں قوی ہوتی نہیں۔ مگر ؎

تا شعارِ مصطفےٰ از دست رفت
قوم را رمزِ بقا از دست رفت!

خطبے کے جملہ مقاصد اس وقت تک پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتے۔
جب تک کہ خطبے کو پوری طرح سمجھا نہ جائے۔ خطبہ میں خدا کی حمد و ثنا کے علاوہ
شریعت کے احکام، اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لئے نصائح، اور قومی و شخصی
ضروریات کے تمام امور پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ غرضیکہ خطبہ مسلمانوں کی اجتماعی
زندگی کا ایک متحرک اور کارفرما پرزہ ہے۔ اس کے ذریعہ تمام مسلمانوں کو جمع کر کے
خدا کے احکام ان پر پہنچائے جاتے ہیں۔ دین کی تعلیمات ان کے ذہن نشین کی
جاتی ہیں۔ ان کی انفرادی و اجتماعی کمزوریوں کی اصلاح کرنے کے علاوہ قومی فلاح و
بہبود کی طرف ان کی توجہ معطوف کی جاتی ہے۔

اگر نماز کی طرح خطبے کیلئے بھی عربی زبان کو لازمی قرار دے دیا جاتا۔ تو اس کا
نتیجہ یہ ہوتا۔ کہ غیر عربی دان لوگوں کے لئے وہ محض ایک بے معنی چیز اور ایک بیجان
مذہبی رسم بن کر رہ جاتی۔ اور شارع کے وہ تمام مقاصد فوت ہو جاتے جن کے
لئے اس نے خطبہ شروع کیا تھا۔ بلکہ ایسی صورت میں خطبہ بالکل بے سود ہو جاتا ہے

اور انہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہے۔ وہ بیٹھے اونگتے رہتے ہیں غنودگی خوب ہوتی ہے۔ اور اچھے خاصے وضو بھی مکروہ ہو جاتے ہیں۔ باقی رہا دل لگنا سو دل تو اسی مضمون پر لگتا ہے جسے انسان سمجھے۔ مگر یہاں تو اکثر اوقات خود پڑھنے والا بھی نہیں سمجھتا۔ کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں اور کیا بتا رہا ہوں۔ خدا جانتا ہے کہ یہ صورت کب سے قائم ہے۔ خطبہ ایک خالص مذہبی مسئلہ تھا۔ ایک ضرورت کی چیز تھی۔ مگر فرزندان توحید نے اپنی کم بختی سے اسے کیا سے کیا بنا دیا۔ اور خطبہ و نماز کے تمام فوائد ضائع ہو کر رہ گئے۔ ؎

جائز کیا جہاد کو شمشیر کے بغیر!
قرآن اگر پڑھا بھی تو تفسیر کے بغیر!

لہذا خطبے کے لئے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عربی زبان لازمی قرار نہیں دی۔ بلکہ خطبہ اسی زبان میں بہتر قرار دیا گیا ہے۔ جسے سامعین بخوبی سمجھ سکتے ہوں البتہ اس سے اتحاد بین الملّی میں ضرور فرق آجاتا ہے۔ مگر اس کا علاج یہ ہے۔ کہ خطبہ کا ایک حصہ تو لازماً عربی زبان میں ہو۔ جو خدا کی حمد و ثناء، رسول اللہؐ اور آپکے اصحابؓ پر صلوٰۃ و سلام اور آیاتِ قرآنی کی تلاوت کے لئے مخصوص کیا گیا ہو اور دوسرا حصہ جو اسلامی تعلیمات، احکام، مواعظ اور وقتی ضروریات پر مشتمل ہو۔ وہ ایسی زبان میں ہو۔ جسے حاضرین یا ان کی اکثریت سمجھتی ہو۔ جس کے لئے ہندوستان میں اردو زبان نہایت موزوں ہے۔ مگر جہاں مسلمانوں کا بین الاقوامی

اجتماع ہو۔ وہاں عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں خطبہ نہ دیا جائے۔

عام فہم زبان میں خطبہ پڑھنے کی ضرورت جس بناء پر ظاہر کی جاتی ہے۔ وہ صرف یہی ہے۔ کہ لوگ اس کو سمجھیں اور فائدہ اٹھائیں۔ گویا اصل مقصود سمجھنا نہیں بلکہ فائدہ اٹھانا ہے۔ لیکن اگر ایسی صورت ہو کہ سمجھنے سے بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہو۔ تو اس صورت میں بجائے سمجھنے کے نہ سمجھنا ہی بہتر ہے۔ اب ذرا اپنی قوم کی حالت کا بھی جائزہ لیجئے۔ یہاں امامت کا معیار حد سے زیادہ پست ہو چکا ہے امامت کا جلیل القدر منصب بعض ایسے نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔ کہ وہ اردو زبان میں خطبے دیکر اپنی قوم کی دینی و دنیوی اصلاح نہیں کر سکتے۔ دوسرا گروہ ایسے علماء کا ہے۔ جو ایسے ماحول میں رہے ہیں۔ کہ اگر انہیں عام فہم زبان میں من مانے خطبے دینے کا موقع دے دیا جائے تو آئے دن سر پھٹول شروع ہو جائے گی۔ اور بجائے فائدہ کے الٹا نقصان شروع ہو جائے گا۔ اب رہے جدید تعلیم یافتہ اصحاب، سو ان میں سے بھی اکثر اپنی کم ظرفی کی وجہ سے ان مسائل کی صحیح صحیح تعبیر نہیں کر سکتے۔ لہذا خطبہ غیر عربیہ کے اجراء سے پیشتر ان خطرات کا تدارک کرنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اہل علم کی کوئی معتدل جماعت خطبات کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کرے جو نزاعی مسائل سے بالکل پاک ہو۔ مسلمانوں کی تمام ضروریات پر حاوی ہو۔ ان کی صحیح رہنمائی کرنے والا ہو۔ ضروریات حاضرہ کے مطابق ہمیشہ اس میں ترمیم و تنسیخ

ہوتی رہے۔ اور اس معتدل مرکزی جماعت کے خطبے باقاعدگی کے ساتھ مساجد میں وقت مقررہ پر پہنچائے جائیں۔ اور جب تک یہ تنظیم نہ ہو، اس وقت تک یہی عربی خطبے چلنے دیئے جائیں۔

ہاں! اگر خوش قسمتی سے کوئی مناسب خطیب مل جائے تو اسکی خدمات سے فائدہ اٹھانے میں دریغ نہ کیا جائے۔ ؎

یارب: دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو روح کو تڑپا دے، جو قلب کو گرما دے!

امام کی ہر دلعزیزی

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اخوّت کی جہانگیری، محبّت کی فراوانی!

امامت ایک ایسا قابلِ قدر منصب ہے۔ جس کا تعلّق ہر کہ و مہ کے ساتھ یکساں ہوتا ہے۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک، جوان سے لے کر ادھیڑ عمر تک، اور جاہل سے لے کر عالم تک وہ ہر قسم کے مقتدیوں کی اصلاح کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ قوم کے منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہوتا ہے۔ جب تک وہ ہر دلعزیز ہو سب کے دل میں اس کی قدر نہ ہو۔ ہر کس و ناکس پر اس کا اثر نہ ہو۔ اس وقت تک وہ اپنے مقصد میں کما حقہٗ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لہذا امام کے لئے ضروری ہے۔ کہ تمام مقتدیوں پر اپنی شخصیت کو ممتاز بنائے۔ اور سب کے سامنے ایک مؤثر اور نفع بخش وجود ثابت ہو۔ ہر فرد و بشر کے دل میں اس کے متعلق خوف و رجا موجود ہو۔ سب پر اس کا اثر ہو۔ اور وہ خود کسی سے مرعوب نہ ہو۔ آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ کا

صحیح مظہر ہو۔ آپ کے تمام تعمیری پروگرام کا حقیقی ترجمان ہو۔ اس کی طبیعت عدل و انصاف کا ماخذ ہو۔ اور اجرائے احکام کے لیئے اس کی اخلاقی جرأت اس کے لیئے عصائے موسوی ہو۔ اور اس کی ہر نقل و حرکت اس کے متقدیوں کے لیئے قابلِ تقلید نمونہ ہو۔

یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے۔ جبکہ امام اپنے کام کا پورا پورا اہل ہو۔ اپنے منصب کے لیئے اسم بامسمیٰ کا مترادف ہو۔ ماہر فن ہو۔ مستعد کار ہو۔ سرگرم عمل ہو۔ اور عوام الناس کے لیئے اس کی شخصیت کسی نہ کسی طرح مفید ہو۔ اس کا وجود بہ سبب ظاہری و باطنی اوصاف کے بارعب ہو۔ جس ماحول میں وہ رہتا ہے۔ اس میں پوری طرح باوقار ہو۔ کوئی بڑی سے بڑی خودغرضی بھی اس کے وقار کو ضائع نہ کر سکے۔ بلکہ اپنی خودداری اور وقار کی حفاظت کے لیئے وہ دنیا کی بڑی سے بڑی نعمتوں کو قربان کرنے کے لیئے تیار ہو۔ قربانی اور ایثار کا مجسمہ ہو۔

امام کا لہجہ ہمدردانہ ہو۔ طبیعت گداز ہو۔ بردبار اور متحمل مزاج ہو۔ بدخو اور ترشرو نہ ہو۔ خود سب کی عزت کرے۔ دوسروں سے اپنی عزت کرانا جانتا ہو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبودی کا مجسم ولولہ ہو۔ اور ان تمام صفات سے متصف ہونے کے علاوہ اپنے فرائض منصبی اور مقصدِ حقیقی کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔ سوائے خدا تعالےٰ کے کسی سے نہ ڈرے۔ ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

امام اپنے مقتدیوں کے ہر شعبہ زندگی کا بہترین مشیر ہو۔ ہر کس وناکس اس کے مشورہ کا ہر وقت محتاج ہو۔ اس کا بہترین مشورہ ان کے لئے تسکین قلب کا باعث ہو۔ اس کا ہر فیصلہ ان کے اطمینان کا سبب ہو۔ اس کی ہر ادا ان کیلئے قابل تقلید ہو۔ اس کا ہر قول ان کی زندگی کا سہارا ہو۔ اس کا ہر فعل ان کے لئے ایک نمونہ ہو۔ باوجود ان سب صفات کے وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ بلکہ سب لوگ اس کے محتاج ہوں۔ اور وہ خود سب سے مستغنی ہو۔

ترقی کیلئے ہے زہر قاتل خوئے محتاجی
کبھی مہتاب خورشید درخشاں ہو نہیں سکتا!

امام کا حسنِ سلوک

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا۔
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات!

امام حسنِ صورت و حسنِ سیرت دونوں اوصاف سے متصف ہو۔ سچ پوچھو تو انسان کی حقیقی خوبصورتی اور اصلی حسن و جمال اس کے اخلاق فاضلہ اور پاکیزہ عادات و اطوار ہیں۔ اسلام میں پرہیزگاری اور ضبطِ نفس سے بڑھ کر کوئی خوبی اور کمال نہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا مقصد ہی تکمیل اخلاق تھا۔ امام ابو حنیفہ رح آدھی دنیا کے مسلمانوں کے امام تھے۔ آپ خوش اخلاقی کے پیکر تھے اسلام کی اخلاقی زندگی کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ آپ کی زندگی حسن عمل کی ایک زندہ مثال تھی۔ ان کے اخلاق کی نکہت سے مشامِ عالم معطر ہوتا تھا۔

اسی طرح مسلمانوں کے ہر امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ متقی اور پرہیزگار ہو۔ منہیات سے بچنے والا ہو۔ سخی اور فیاض ہو۔ دنیوی عزت و جاہ کو حقیر سمجھے۔ اہلِ غرض سے متعرض رہے۔ اپنی روزی خود کسی مستقل پیشہ کے ذریعے پیدا کرے۔

علم و مال دونوں کو دینی و ملی خدمت میں خرچ کرے۔ مزاج میں تصنع اور تکلف نہ ہو۔ خوش وضع و خوش پوش ہو۔ لغویات سے کنارہ کشی کرے اور امر حق کے اظہار کی جرأت رکھتا ہو۔

امام ابو حنیفہؒ حق گوئی کا نمونہ تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید اور اس کی بیوی حرہ خاتون میں کچھ شکر رنجی ہو گئی۔ خاتون کو شکایت تھی۔ کہ خلیفہ عدل نہیں کرتا۔ منصور نے کہا کسی کو منصف قرار دو۔ خاتون نے کہا اچھا میں اس معاملے میں امام صاحب کو منصف قرار دیتی ہوں۔ چنانچہ امام صاحب کو طلب کیا گیا۔ اور خاتون پس پردہ بیٹھ گئی۔

پھر منصور اور امام صاحب میں حسب ذیل گفتگو ہوئی:۔

منصور۔ شرع کی رو سے مرد کتنی عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے۔

امام صاحب۔ چار عورتوں سے۔

منصور (پردہ کی طرف مخاطب ہو کر) سنتی ہو! امام صاحب کیا فرما رہے ہیں (پردہ سے آواز آئی)، ہاں سنا۔

امام صاحب۔ (منصور سے) مگر یہ اجازت اس شخص کے لئے خاص ہے۔ جو چاروں میں عدل و انصاف قائم رکھنے پر قادر ہو۔ ورنہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا اچھا نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً"

پس منصور یہ سنکر چپ ہو گیا اور امام صاحب اپنے گھر واپس آ گئے۔ خاتون نے

بعد میں امام صاحب کی حق گوئی سے خوش ہو کر پچاس ہزار درہم آپ کی نظر بھیجے۔ مگر آپ نے واپس کر دیئے۔ اور فرمایا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ کسی غرض سے نہیں۔ بلکہ اپنا فرض منصبی سمجھ کر کہا ہے۔ ؎

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو!

غرضیکہ امام حق و صداقت کا مجسمہ ہو اور خوش اخلاق ہو۔ خود اپنے مقتدیوں سے نیک سلوک کرے اور انہیں حسن سلوک کی ترغیب دے۔ اخوت اور ہمدردی کے جذبات ان میں بیدار کرے۔ برادرانہ الفت پیدا کرے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ رنج و غم میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔ اور اپنی چند روزہ زندگی کو خوشگوار اور کامیاب بنائیں ؎

وہ چال چل کہ عمر خوشی سے کٹے تیری
وہ کام کر کہ یاد تجھے سب کیا کریں!

امام کا پیشہ

جھکے جو آدمی ہو کر بھی غیر اللہ کے در پر
بشر حاصل تو کیا ہوگا، وہ شیطاں ہو نہیں سکتا!

جو لوگ اپنی روزی کے لئے کوئی مستقل پیشہ نہ رکھتے ہوں۔ اور گمراہوں کی جیب سے پیسے نکالنے کے لئے طرح طرح کے حیلے بنانے والے ہوں۔ وہ امامت کے قابل نہیں۔ ہادی برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام یا آپ کے صحابہؓ نے کبھی ہدایت کی اُجرت نہیں لی۔ اور کتاب اللہ بار بار اپنے پیغمبروں کی زبانی یہ بتاتی ہے۔ کہ جو لوگ اصلاح و ہدایت کیلئے کوشش کرتے ہیں۔ وہ محض خدا تعالیٰ کی خوشنودی اور عوام کی بہبودی کے لئے کرتے ہیں۔ اور وہ کوئی معاوضہ نہیں چاہتے۔

کسی نبی یا ولی نے آجتک بغیر ہاتھ کی کمائی کے نہیں کھایا۔ حضرت داؤد علیہ السلام لوہے کی زرہ بناتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام چٹائی بنا کرتے تھے۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کو اپنا ذریعہ معاش ٹھہرایا اور حضرت ابراہیم ادہم رحمتہ اللہ علیہ نے مدینہ میں لکڑیاں فروخت کر کے اپنی روزی

پیدا کی۔ غرضیکہ کوئی نبی یا ولی اپنے مریدوں کا دستِ نگر نہ بنا۔ اسی لئے اُن کی بات میں وزن اور کلام میں اثر تھا۔

مگر آجکل ہدایت پیشہ لوگ، وعظ کی اُجرت، دعا کی نذر اور پیری کی دست گیری مانگتے ہیں۔ اور معمولی شُد بُد کے امام مسجد بھی پانچوں وقت کی امامت کرانے کے سوا اگر کوئی اور ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ تو وہ نیاز کے پیسے وصول کر کے تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کر دینا ہے۔ فاتحہ کی روٹی ان کا من وسلویٰ اور مل گئی تو کفن کی چادر مالِ غنیمت مسجد سے تنخواہ ان کی نماز پڑھانے کی صحیح اُجرت اور معاش کا ذریعہ ہے۔ پھر انکی بات میں قوت کیسے ہو۔ جبکہ یہ خود محتاج ہیں۔ اُنکی اصلاح کیسے کریں۔ ؎

ترقی کے لئے ہے زہرِ قاتل خوئے محتاجی
کبھی مہتاب خورشیدِ درخشاں ہو نہیں سکتا!

انکی زندگی کا تاریک ترین پہلو یہ ہے۔ کہ مسلمانوں میں اختلاف کا بڑھانا اور ان میں شدت کا پیدا کرنا ان کا معیارِ افتخار بن چکا ہے۔ اور ایسے لوگوں کی بدولت ملتِ واحدہ میں مذہبی، سیاسی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے اتنی نفرت انگیز تفریق ہوتی جا رہی ہے۔ کہ اس کا رفع کرنا کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ غرضیکہ ہمارا یہ ناقابلِ قدر طبقہ فرائض کسب سے اتنا ہی غافل ہے۔ جتنا کہ دوسرے نماز روزہ سے لاپرواہ ہیں۔ جائے غور ہے کہ جب جیتی جاگتی دُنیا پر انہیں قابو نہ رہا۔ تو یہ کیونکر یقین آسکتا ہے۔ کہ ان دیکھی دُنیا ہنوز ان کے ٹھیکے میں ہوگی ؎

اے بسا آدم کہ ابلیسی کند
اے بسا شیطاں کہ ادریسی کند!

ہمارے علماء میں آزادی دبیباکی کی طاقت اسلئے نہیں۔ کہ وہ اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ دوسروں کے محتاج ہیں۔ انکی تمام اغراض بے دینوں، منافقوں، کافروں اور اہل بدعت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہزاروں تعلقات اور مصلحتیں ہیں۔ جو انکی زبان پر تالا ڈالے ہوئے ہیں اور سینکڑوں ایسے امور ہیں جو اظہارِ حقیقت کی راہ میں ان کیلئے سدِ راہ ہیں۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمان ملک التجار تھے۔ چار دانگِ عالم میں انکی تجارت کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ بندرگاہیں ان کے دم سے آباد تھیں۔ آقائے نامدار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود تاجر تھے۔ آپکے خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی تاجر تھے حضرت عثمان غنی رضی کی غناء کا راز اسی تجارت میں مضمر تھا۔ اور امام ابو حنیفہ رح کا مستقل ذریعہ معاش اسی تجارت پر تھا۔ پس آمدنی کے وسائل میں سے تجارت ہی ایک ایسا کامیاب ذریعہ ہے جس سے دینی و دنیوی ترقی کی راہیں کھل سکتی ہیں۔ لہذا خود تجارت کرو۔ اپنے مقتدیوں کو تجارت کا شوق دلاؤ۔ البتہ تجارت کیلئے امانت، و دیانت، خوش اخلاقی، پاکبازی، محنت، خوش معاملگی اور لین دین میں صفائی ضروری ہے۔ بدوں ان کے کامیاب ہونا ناممکن ہے۔

ہر کام میں کامیاب ہونے کے لئے
محنت کرو، محنت کرو، کہ ہے محنت درکار!

امام کی صنعت

غافل منشیں نہ وقتِ بازی ست
وقتِ ہُنر است و کارسازی ست!

امام کو ہر دلعزیز بننے کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ ماہرِ فن ہو، باہنر ہو، ہر فرد و بشر کو اس کی ضرورت ہو۔ اس کا وجود کسی نہ کسی طرح سب کے لئے فائدہ بخش ہو۔ اور وہ خود حتے الوسع دوسروں سے مستغنی ہو۔ اور اپنی معاش کے لئے کوئی شریفانہ پیشہ رکھتا ہو۔ علمی، ادبی، اخلاقی، اور اقتصادی حالت میں اپنے زیرِ اثر حلقہ میں سب سے ممتاز ہو۔ قیادت کا پورا پورا اہل ہو۔ سب لوگ اس کی دل و جان سے عزت کریں۔ زبان سے اس کی بزرگی کا اعتراف کریں۔ اس کے احکام کی برضا و رغبت تعمیل کریں۔ اور ہر نقل و حرکت میں اس کی تقلید کرنا باعثِ فخر سمجھیں۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ سب اس کے محتاج ہوں اور وہ خود کسی کا محتاج نہ ہو۔ ہے

دستِ طلب بہ پیش کسے کردہ دراز
پل بستہ کہ از آبروئے خویش بگذری!

یعنی تو نے اگر طلب کا ہاتھ کسی دوسرے کے آگے دراز کیا۔ تو اپنی آبرو کے (آبرو) سے گذر جانے کے لئے ایک پل تیار کر لیا۔ مطلب یہ کہ سخت کوش کی آبرو گوارا نہیں کرتی کہ دوسروں کی امداد سے تحصیلِ مدعا کرے۔ آسان گیری کو وہ بے آبروئی سمجھتا ہے۔ اور سخت کوشی و ضبطِ نفس سے کام لے کر حصول مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ؎

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی، گر کل نہ ڈوبی!

اگر امام تدرے طبابت اور خصوصاً ابتدائی طبی امداد (Firsr Aid) سے واقف ہوگا۔ اتفاقی حادثات میں لوگوں کی مدد کرنا جانتا ہوگا۔ ناگہانی صدمات کا تدارک آتا ہوگا۔ فوری ضروریات کو پورا کر سکتا ہوگا۔ اور دوسروں کے لئے مفید ہوگا۔ تو اس کی قدر و منزلت بہت زیادہ ہوگی۔ اس کے تعلقات وسیع ہونگے ہر وقت دوسروں کو اس کی حاجت رہے گی۔ وہ خود کشاں کشاں اس کے پاس آئیں گے۔ اور اسے رشد و ہدائت کا زیادہ موقع ملے گا۔ لہذا ہر امام کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ فسٹ ایڈ سے پوری طرح واقف ہو۔ تیمارداری کے قاعدے جانتا ہو۔ اتفاقی حادثات اور ناگہانی واقعات کا تدارک کر سکے۔

اور اگر اس کے ساتھ تھوڑی سی طبابت اور دوا سازی بھی سیکھ لے۔ تو پھر سونے پر سہاگہ ہے۔ امام کیلئے ایک نہائت مختصر سی ڈسپنسری (Dispensary) کا قائم کرنا بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ جس میں ضروری نسخہ جات ہر وقت تیار ہوں اور لوگوں کی ناگہانی ضروریات کو کفائت کر سکیں۔

علاوہ ازیں امام کیلئے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ وہ شرعی تحریرات از قسم نکاح وغیرہ لکھ سکتا ہو۔ ڈاک اور تار کے ضابطہ سے پوری پوری واقفیت رکھتا ہو۔ کاغذات مال کے سمجھنے پر قدرے عبور ہو۔ موٹی موٹی دیوانی و فوجداری دفعات سے واقف ہو۔ غرضیکہ ہر فن مولا کا مترادف ہو۔ اور دوسروں کا دست نگر نہ ہو۔ ؎

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است

رفتن بہ پائے مردئ ہمسایہ در بہشت

امام کی تربیت!

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں!
بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست!

آئمہ مساجد کے لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ علمی استعداد ہے۔ اگر علمی استعداد تسلی بخش ہوگی۔ تو وہ شخص ہر قسم کی ضروریات کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔ مطالعہ کتب سے مدد لے سکتا ہے۔ رسالوں اور اخباروں کے مطالعہ سے مدد لے سکتا ہے۔ مذہبی اصولوں کی اہمیت کو خود سمجھ سکتا ہے۔ دوسروں کو سمجھا سکتا ہے۔ سیاسی حالات پر تبصرہ کر سکتا ہے قوم کی ترقی و تنزل کے اسباب پر بحث کر سکتا ہے۔ اور کچھ عرصے کی جدوجہد کے بعد اپنے فن کا پورا پورا اہل بن سکتا ہے۔ مگر برخلاف اس کے اگر علمی استعداد ہی کم ہوگی۔ تو کلر زمین کی طرح وہاں کوئی چیز نہیں اُگ سکتی۔ اور ایسی زمین میں خواہ مخواہ بیج ڈال کر اس کا ضائع کرنا دانشمندی کے خلاف ہے۔

آئمہ مساجد کے لئے دوسری ضروری چیز مطالعہ کتب کی عادت ہے۔

"علم بہ بحث مال بہ تجارت" علمی استعداد کوئی ماں کے پیٹ سے لے کر نہیں آتا، مطالعہ سے جس قدر چاہیں اپنی استعداد بڑھا سکتے ہیں، مگر جنہیں علم سے محبت نہیں، مطالعہ کی عادت نہیں۔ وہ قدرتی طور پر علم سے متنفر، اہل علم کے دشمن، علماء کی صحبت سے بیزار اور جہلاء کی صحبت کے عادی ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ کہ اہل علم ان کی امامت سے بیزار ہو کر ان کے ساتھ مسجد سے، مسجد کے ساتھ نماز سے، نماز کے ساتھ دیگر ارکان دین سے اور ہوتے ہوتے اسلام سے بھی بیزار ہو جاتے ہیں۔ پس ایسے امام کے ہونے سے اس کا نہ ہونا ہی بہتر ہے اور ایسے امام سے جس قدر جلدی ہو سکے مسجد کو خالی کرا لینا چاہیئے۔ ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

دنیا میں جتنے بھی بڑے بڑے پیشے ہیں سب کے لئے کہیں نہ کہیں ٹریننگ سنٹر بنے ہوئے ہیں۔ کلرک سے لیکر افسر انچارج تک، پٹواری سے لے کر افسر مال تک، ٹیچر سے لے کر پرنسپل تک، اور سپاہی سے لے کر جرنیل تک غرضیکہ کوئی اہلکار اپنے اپنے کام کا پورا پورا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ جب تک کہ وہ اپنے محکمہ سے باقاعدہ ٹریننگ لے کر کامیابی کا سارٹیفکیٹ حاصل نہ کرے۔ اور محکمہ مذکور کے بڑے بڑے ماہر فن اس کی قابلیت پر صاد نہ کریں۔

مگر امامت کے جلیل القدر منصب کی باگ ڈور ایک اناڑی، جاہل اور کندۂ ناتراش کے

ہاتھوں میں دے دینا اور پھر آئے روز قوم کی گری ہوئی حالت کے رونے رونا اور قومی اصلاح کے لئے العطش العطش کی پکار کرنا کس قدر تعجب انگیز ہے۔ امام مسجد جو دراصل اپنی قوم کا سچا ریفارمر ہے۔ مذہبی پیشوا ہے۔ سیاسی لیڈر ہے۔ معلم ہے اور ادیب ہے۔ جب تک باقاعدہ اس کی ٹریننگ نہ کی جائے۔ اسکی تربیت کے لئے ایک بہترین نصاب تیار نہ کیا جائے۔ اسے ہر قسم کے ضروری ہتھیاروں سے مسلح نہ کیا جائے اس وقت تک قومی اصلاح کے لئے کوشش کرنا ہوا پر گرہ لگانے کا حکم رکھتا ہے ؎

AHMAD

مثالِ ماہ چمکتا تھا جن کا داغ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی!

پس حکومت پاکستان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ آئمہ مساجد کی اصلاح کیلئے ایک مستقل ادارہ قائم کریں۔ خاص قابلیت کے اصحاب اس جلیل القدر منصب کیلئے انتخاب کئے جائیں۔ جگہ بجگہ ان کیلئے ٹریننگ سنٹر بنائے جائیں۔ ماہرفن اساتذہ کی زیرنگرانی ان کو ٹریننگ دی جائے بعد میں انکی قابلیت کا باقاعدہ امتحان لیا جائے اور کامیاب اصحاب کو امامت کی سند دیکر فارغ کر دیا جایا کرے۔ اور وہاں سے فارغ التحصیل اصحاب کو اس عہدۂ جلیلہ پر سرفراز کیا جایا کرے۔ تو اس طرح قوم کی انفرادی و اجتماعی اصلاح کی امید کی جاسکتی ہے ؎

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تیری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

امام کی ضروریات

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فروغ کہ تو!
کتاب خواں ہے، مگر صاحبِ کتاب نہیں!

ہر ایک پیشہ ور اپنی اپنی ضروریات کی چیزیں ہر وقت اپنے پاس موجود رکھتا ہے۔ سپاہی اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کر لیتا ہے تب میدانِ جنگ میں جانے کے قابل ہوتا ہے۔ طالب علم اپنی تمام ضروریات کی چیزیں بستہ میں رکھ لیتا ہے تب مدرسے کی راہ لیتا ہے۔ جس طرح ایک بہترین طبیب اپنے استعمال کی تمام کتب ہر وقت اپنے مطب میں موجود رکھتا تھا۔ اسی طرح ایک ماہر امام بھی اپنی ضروریات کی تمام کتب ہر وقت اپنے پاس موجود رکھتا ہے سو اس کے لئے ہر ایک مسجد میں ایک مختصر سا کتب خانہ قائم کرنا اشد ضروری ہے۔ خواہ وہ کتب خانہ امام مسجد خود مہیا کرے خواہ مسجد کے مشترکہ فنڈ اور مقتدیوں کی مدد سے تیار کر لیا جائے۔ یہ کتب خانہ مسجد میں یا مسجد سے ملحقہ مکان یا امام کے حجرہ میں ہونا چاہئے۔ جہاں امام بوقتِ ضرورت ہر قسم کے مسائل دیکھ سکے اور مقتدیوں کی تمام ضروریات پوری کر سکے۔

امام مسجد کے کتب خانہ میں کم از کم حسب ذیل کتب[1] کا ہر وقت موجود رہنا اشد ضروری ہے۔ جو معمولی قابلیت کے امام کی پیش آمدہ ضروریات کو بطریق احسن پورا کر سکیں گی۔

۱۔ خطبات بدر۔ جو زمانہ حاضرہ کے مسلمانوں کی تمام ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہایت عام فہم۔ دلچسپ اور سلسل اردو زبان میں خاص ترتیب سے مرتب کئے گئے ہیں۔ تمام خطبات نزاعی مسائل سے مبرا اور دیہاتی و شہری تمام مسلمانوں کی جملہ ضروریات پر حاوی ہیں۔ مسلمانوں کی دینی، دنیوی، مذہبی اور سیاسی و اقتصادی اصلاح کا مکمل نصاب ہیں۔ ہر ایک خطبہ اپنے اپنے موقع و محل کے مطابق ایسی حکمت عملی سے تیار کیا گیا ہے۔ کہ پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی تیار کیا گیا ہے۔ معمولی سے معمولی قابلیت کا امام بھی حسب استعداد اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

۲۔ العقائد۔ انسانی دل و دماغ میں مذہب اسلام کا صحیح تصور پیدا کرنے کے لئے تمام ضروری عقائد اسلام کو یکجا فراہم کر کے کتاب ہذا کے مختلف الابواب میں بہترین ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور ہر ایک بات کو عقلی و نقلی دلائل سے

---

[1] یہ تمام کتب مؤلفہ مولوی بدرالدین صاحب بدر جالندھری شیخ غلام علی اینڈ سنز کتاب منزل تاجران کتب لاہور سے آئمہ مساجد کو مناسب کمیشن پر اور دوسرے لوگوں کو اصل قیمت پر مل سکتی ہیں۔ یا ہر ایک شہر کے مشہور تاجر کتب کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

اس طرح ثابت کیا گیا ہے۔ کہ پڑھتے ہی صفحۂ دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ طرزِ بیان سادہ مگر دلکش ہے۔

۳۔ الارکان۔ اسلامی عمارات کی تمام بنیادوں اور اس کے در و دیوار کی تکمیل کے لئے تمام ارکانِ اسلام نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ کے متعلقہ مسائل کتاب ہٰذا کے مختلف ابواب میں بہترین ترتیب سے مرتب کئے گئے ہیں۔ نئی روشنی کے تعلیم یافتہ طلباء کے مذاق سے موافقت پیدا کرنے کیلئے تمام مسائل کی فلاسفی ساتھ ساتھ ایسے مؤثر انداز میں لکھی گئی ہے جو پڑھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ طرزِ بیان دلچسپ اور عام فہم ہے۔

۴۔ الاخلاق۔ اسلامی عمارت کی چھت کی تکمیل کے لئے اور مسلمانوں کی ادبی، اخلاقی اصلاح، تمام اسلامی آداب و اخلاق کو کتاب ہٰذا کے مختلف ابواب میں مؤثرانہ انداز میں مرتب کیا ہے۔ طرزِ بیان ایسا دلکش اور مؤثر ہے۔ کہ اس کے مطالعہ سے دل نہیں اکتاتا۔ اور ساتھ ساتھ ہر ایک چیز صفحۂ دل پر نقش ہوتی جاتی ہے۔

۵۔ الرّوحانیت۔ اسلامی عمارات کو رنگ و روغن کرلے اور اسے ہر قسم کے سامانِ آرائش و زیبائش سے آراستہ کرنے کے لئے اسلام کے تمام ضروری روحانی مسائل کو کتاب ہٰذا کے مختلف ابواب میں خاص طریق سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور انسان کی روحانی اصلاح کے تمام لوازمات کے علاوہ معرفت

الٰہی کا صحیح راہ دکھایا گیا ہے۔

۶۔ الانبیاء، الصحابہ، الاولیاء وغیرہ دیگر کتب کا بھی آئمہ مساجد کے کتب خانہ میں موجود ہونا ضروری ہے۔ جن سے بوقتِ ضرورت، کافی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

۷۔ علاوہ ان کے قرآن مجید۔ بہترین تفسیر قرآن۔ بخاری شریف یا اس کا اردو ترجمہ۔ تاریخ اسلام اور مسلمانوں کی اقتصادی و سیاسی ضروریات کیلئے بھی مختلف کتب کا چھپا کر چھوڑنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ ؎

فتوٰی ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دُنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر!

امام کا مدرسہ

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا!

ہندوستان کی مساجد کسی زمانے میں بہترین مکتب سمجھی جاتی تھیں جن میں تمام شرفاء کے بچے تعلیم پاتے تھے۔ اور ان میں وہ تعلیم ہوتی تھی جس سے ہمارے طلبہ سرسید، شبلی، حالی، محمد علی اور اقبال بن کر نکلتے تھے۔ اور وہاں کے امام یا معلّم کی نہ صرف طلباء بلکہ رؤسا و امراء اور محلّہ و شہر میں وہ عزت ہوتی تھی۔ جو آج کسی کالج کے پرنسپل کو بھی نصیب نہیں۔ وہ رعب تھا کہ طلباء گھروں میں بیٹھے ان کے نام سُن کر لرزتے تھے۔ وہ ادب تھا، کہ بڑے بڑے اکابر انہیں دیکھ کر تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور عمر بھر ان کا نام ادب سے لیتے رہتے تھے۔ وہ صرف تعلیم کا ہی نہیں بلکہ بچوں کی تربیت کا بھی خیال رکھتے تھے۔ جہاں کہیں ہوتے تھے۔ امام صاحب کی چشمِ عتاب کا تصوّر انہیں شرارت و برائی سے روکے رکھتا تھا۔ غرضیکہ مسجد کی تربیت اور صحنِ مسجد کی تعلیم ان میں انسانیت و

اخلاق کے تمام جوہر پیدا کر دیتی تھی۔ اور جب یہ تعلیم سے فارغ ہوتے تھے تو ایک خوش اخلاق انسان اور موثر نمازی کی صورت میں دُنیا کے سامنے آتے تھے۔ اور اپنی عملی زندگی میں جو کامیابی حاصل کرتے تھے۔ تمام دنیا ان پر رشک کرتی تھی۔ جس طرح علمی و مجلسی سوسائٹیوں میں وہ ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح معاشرتی و تمدنی دنیا میں بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مگر اب

نکوکاری کے پردے میں گنہگاری کے جلوے ہیں
مقدس بارگاہوں میں ریاکاری کے جلوے ہیں

مساجد کے ان مکاتب میں قرآن کریم و احادیث نبویؐ کے علاوہ فقہ، منطق، فلسفہ، ریاضی اور تاریخ وغیرہ تمام علوم متداولہ کی تعلیم کا بہترین انتظام تھا۔ مسلمان تو درکنار ہزاروں غیر مسلم بھی ان اسلامی درسگاہوں کے مرہون منت ہوتے تھے۔ مگر برخلاف اس کے آج "گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا + کار طفلاں تمام خواہد شد" والا معاملہ ہے۔ غیر مسلم تو درکنار مسلمانوں کے لئے بھی وہ مکاتب ننگِ قوم کا باعث بن رہے ہیں۔ یا تو وہاں درس و تدریس کا کوئی انتظام ہی نہیں اور اگر ہے۔ تو قاعدہ بغدادی، الم اور زیادہ سے زیادہ ناظرہ۔ قرآن خوانی تک ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور اگر شاذ و نادر کہیں اعلیٰ تعلیم کا بھی انتظام ہے تو وہ بھی ادھورا ہے۔ اور وہاں کا ماحول ایسا زہریلا ہے۔ کہ جو طالب علم

وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔ وہ اس زہریلے ماحول سے متاثر ہو کر
ضدی، ہٹ دھرم، متعصب اور نزاعی مسائل کے مبلغ بن کر اپنی ساری
قوت اتحادِ ملّی کی دھجیاں بکھیرنے پر صرف کر دیتے ہیں۔ اور قوم کے لئے خسر الدنیا
والآخرہ کے مصداق بنتے ہیں۔ ؎

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا، تجھ کو بوئے گُل کا سراغ!

اگر ان تمام امور کے علل و اسباب پر غور کیا جائے۔ تو اس کی زیادہ تر
ذمہ داری آئمہ مساجد پر عائد ہوتی ہے۔ اوّل تو وہ خود بہترین معلّم بننے کے اہل
ہی نہیں۔ اور اگر ہیں۔ تو اس قابل نہیں کہ وہ اپنے طلباء کے لئے ایسا بہترین
نصاب تجویز کر سکیں جو مسلمانوں کی تہذیب نفس اور تزکیہ قلب کے علاوہ قوم
کے اجتماعی مفاد کا بھی حامل ہو سکے۔ لہذا پاکستان اور ہندوستانی مساجد کی
درسگاہوں میں مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کے لئے مندرجہ ذیل مختصر مگر مکمل تعلیمی
نصاب نہائت مناسب ہے۔ اور مبتدیوں و سکولوں کے تعلیم یافتہ طلباء کی مذہبی
مجلسی تعلیم کے لئے کافی ہے۔ جو علاوہ مذہبی و اخلاقی تعلیم کے ادبی تعلیم کا بھی
حامل ہے۔ اسباق کے شروع میں مشکل الفاظ کی تشریح اور بعد میں دہرانے کیلئے
امتحانی سوالات دیئے گئے ہیں۔ اس نصاب کی ایک مختصر سی لائبریری ہر ایک
مسجد میں ہر وقت موجود ہو۔ اور طلباء مسجد میں سبقاً سبقاً پڑھنے کے علاوہ گھر پر

بھی اس کا مطالعہ کریں۔ یہ تمام کتب مؤلفہ مولوی بدر الدین صاحب تاجر عبداللہ مصری
تاجر کمپنی اور ہر شہر کے مشہور تاجر کتب سے مل سکتی ہیں

بچوں کیلئے دینیات کا نیا نصاب

۱۔ مفتاح القرآن۔ تلاوت قرآن کریم سکھانے کے لئے ایک مختصر مگر مکمل قاعدہ ہے۔ جسے مبتدی استاد کی مدد سے ایک ماہ میں اور اردو پڑھا ہوا شخص بغیر استاد کی مدد کے ایک ہفتہ میں مطالعہ کر کے صحیح قرآن مجید پڑھ سکتا ہے۔

۲۔ سلسلہ عقائد اسلام المعروف بہ الایمان، الاسلام، التوحید، الرسالت القرآن، الاعمال اور الآخرت وغیرہ سات حصص میں مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کیلئے تیار کیا گیا ہے۔

۳۔ سلسلہ ارکان اسلام المعروف بہ الاذان، الطہارت، الصلوٰۃ، الجماعت، الصوم، الزکوٰۃ اور الحج وغیرہ سات حصص میں تعلیم الارکان کیلئے تیار کیا گیا ہے۔

۴۔ سلسلہ اخلاق اسلام المعروف بہ الآداب، الحقوق، الاوصاف، العادات، الاخلاق، الاصلاح اور الانسان وغیرہ سات حصص میں مسلمانوں کی ادبی، اخلاقی و روحانی حالتوں کی اصلاح کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

امام کا روزانہ پروگرام

یار ڈوبے اُلفت اغیار میں
کشتی اسلام ہے منجدھار میں
ہمتوں کا جوش کا ایمان کا
صبح سے نیلام ہے، بازار میں!

دنیا میں ہر قسم کی کامیابی باقاعدگی سے اور ہر قسم کی باقاعدگی پابندیٔ اوقات سے حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ کوئی شخص بھی بدون انضباط اوقات اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لہذا رہنمایان قوم کے لئے عموماً اور آئمہ مساجد کے لیے خصوصاً اس بات کا اہتمام کرنا نہ صرف ضروری بلکہ لازمی ہے۔ اور انہیں اپنے تمام فرائض منصبی اور اوقاتِ یومیہ کو ایسی خوش اسلوبی اور عمدگی سے ترتیب دینا چاہیئے۔ کہ عامۃ الناس ان کی تقلید کرنا باعث فخر سمجھیں۔ اور ان کا مجوّزہ پروگرام عوالناس کے لئے عمدہ نمونہ کا کام دے۔ جب مجوّزہ پروگرام مرتب کر لیا جائے۔ تو اس پہ کاربند رہنا اور اسے

معرض عمل میں لانا انسان کے استقلال پر منحصر ہے۔ جب تک انسان اپنے حقیقی مقصد کو ہر وقت پیش نظر نہ رکھے۔ اور اپنی تمام نقل و حرکت کو اسی مقصد وحید کی تحصیل کے لئے آلۂ کار نہ بنائے اور اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو اس پر وقف نہ کرے۔ اس وقت تک منزلِ مقصود پر پہنچنا مشکل ہے۔

لہٰذا میں نے آئمہ مساجد کی رہنمائی کے لئے ان کے روزمرہ اوقات کی تقسیم کا ایک مختصر سا خاکہ تجویز کر دیا ہے۔ جس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ ہر ایک امام مسجد اسے اپنا دستور العمل بنانے پر مجبور ہے۔ بلکہ ہر ایک شخص اپنے اپنے حالات کا موازنہ کر کے اس میں مناسب تبدیلی عمل میں لا سکتا ہے۔ اور اپنی ذات کے لئے وہ خود ایک مفصل پروگرام تیار کر سکتا ہے۔ اور اسی کو اپنا دستور العمل بنا سکتا ہے۔ البتہ اپنے تجویز کردہ پروگرام کو بھی عملی جامہ پہنانا کوئی آسان کام نہیں۔ بلکہ کارے دارد والا معاملہ ہے۔ جو شخص اپنے ہی بنائے ہوئے قانون کی پابندی نہیں کر سکتا۔ اور آئینی حکومت پر کاربند نہیں ہو سکتا۔ اس کا امام بننا تو درکنار وہ ایک متمدن انسان کہلانے کا بھی مستحق نہیں۔

پس ایک بہترین امام مسجد کے لئے اس کے روزانہ پروگرام کا سرسری خاکہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ حوائج ضروریہ سے فراغت۔ ۲۔ فجر کی نماز، نمازیوں سے چند باتیں۔ ۳۔ درس قرآن۔ بچوں کی تعلیم و تربیت۔ ۴۔ محلہ یا گاؤں کا دورہ فجر کے غیر حاضروں کو نماز کی تاکید اور بیماروں کی دیکھ بھال وغیرہ۔ ۵۔ کھانا و آرام۔ ۶۔ مطالعہ کتب و اخبار بینی اور اپنا کاروبار۔

۷۔ ظہر کی نماز اور اپنا کاروبار۔

۸۔ عصر کی نماز اور اپنا کاروبار۔

۹۔ مغرب کی نماز۔ کھانا و سیر و تفریح۔

۱۰۔ نماز عشاء۔ نمازیوں سے چند باتیں۔

امام کا سالانہ پروگرام

تم نہیں جانتے قرآں کیا ہے
تم نہیں جانتے ایماں کیا ہے
معجزوں کو تو سُنتا دلچسپی سے
یہ بھی سمجھے کہ مسلماں کیا ہے!

چونکہ آئمہ مساجد کے لئے اپنی ذاتی زندگی کو باقاعدہ بنانے کے علاوہ اپنے مقتدیوں کی اجتماعی حالت کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ ان کی اجتماعی خرابیوں کی ساری ذمہ داری امام مسجد پر ہی عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کی اصلاح کا سارا بوجھ بھی اس کے کندھوں پر ہے۔ بہتریں امام مسجد کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ جس طرح اسے اپنی حالت کا ہر وقت جائزہ لینا چاہیئے اسی طرح اسے اپنے مقتدیوں اور زیر اثر علقے کے لوگوں کی اجتماعی حالت کا بھی موازنہ کرنا چاہیئے۔ اور ان کی اجتماعی کمزوریوں کی تشخیص کرکے ان کی اصلاح اور دین متین کی نشر و تبلیغ کے لئے ایک مستقل پروگرام مرتب کرے۔

امام مسجد کے ذمہ چونکہ بے شمار فرائض منصبی ہیں۔ اور وہ ایک ہی وقت میں تمام ضروری امور پر کما حقہٗ توجہ نہیں دے سکتا۔ اور جب تک کسی چیز پر پوری پوری توجہ نہ دی جائے۔ اور اس کے تمام پہلوؤں پر پورا پورا غور نہ کیا جائے۔ اس کی تمام جزئیات پر نظر نہ دوڑائی جائے۔ اس وقت تک کوئی مقصد پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔

لہذا بہترین امام مسجد کے لئے ضروری ہے۔ کہ اپنے روزانہ دستور العمل کی طرح اپنی تمام ذمہ داریوں کو پیشِ نظر رکھ کر ایک سالانہ پروگرام بھی مرتب کرے۔ اور اپنے اس تیار کردہ تعمیری پروگرام کے ایک ایک شعبہ کی تفصیلات پر غور کرے اور تمام اصلاحی ضروریات کو اپنے اپنے وقت پر ایک ایک کرکے معرضِ عمل میں لائے۔ اور سب کو ایک ایک کرکے ان کے وقت مقررہ پر اس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔ کہ کسی معاملے کا کوئی ایک پہلو بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

بہترین امام مسجد کے سالانہ پروگرام کا ایک مختصر سا سرسری خاکہ حسب ذیل ہے:۔

ہر ایک امام مسجد اپنے اپنے مقامی حالات اور ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر اس میں مناسب تبدیلی کرلے۔ اور ایک مکمل دستور العمل اپنے لئے تیار کرلے۔

محرم	صفر	ربیع الاوّل
ذکرِ شہادت	اتحاد و ایثار	میلاد النبیؐ
فلسفۂ شہادت	قومی تنظیم	سیرت رسولؐ
ربیع الثانی	**جمادی الاوّل**	**جمادی الثانی**
مسلمانوں کی ادبی اصلاح	مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح	مسلمانوں کی روحانی اصلاح
رجب	**شعبان**	**رمضان**
معراج النبیؐ	شب برات	نماز، روزہ، لیلۃ القدر
سیاسی اصلاح	اقتصادی اصلاح	ضرورت القرآن
شوال	**ذی القعدہ**	**ذی الحجہ**
عید الفطر	اسلامی تقریبات	عید الضحےٰ
زکوٰۃ	اصلاح اسلام	حج